متفرقاتِ آرزو

انور حسین آرزو

اُتّر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ

کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ جامع مسجد دہلی

© اترپردیش اردو اکادمی

متفرقات آرزو

سید انور حسین آرزو

MUTAFARRIQAT.E. ARZOO

SYED ANWAR HUSAIN ARZOO

PRICE 3/60

سال اشاعت : ۱۹۸۲ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۳/۶۰

عزیز ایجاز خاں سکریٹری اترپردیش اردو اکادمی نے نشاط پریس ٹانڈہ، ضلع فیض آباد سے چھپوا کر بلہرہ ہاؤس۔ قیصر باغ لکھنؤ سے شائع کی۔

فہرست

مقدمہ فغان آرزو:	وصی احمد اخگر	۵
رسالہ میزان الحروف		۲۱
رسالہ حالاتِ جلال		۴۴
مثنوی دُردانہ		۶۸
جیون سرود		۹۵

کلیاتِ آرزو

اترپردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع شدہ علامہ سید انور حسین آرزو مرحوم کا کلیات مندرجہ ذیل حصوں میں دستیاب ہے

۱۔	فغانِ آرزو	قیمت پیپر بیک	۵/۷۵	پختہ جلد ۷/-
۲۔	نشانِ آرزو	"	۵/۱۵	" ۶/۴۰
۳۔	جہانِ آرزو (فوٹو آفسیٹ ایڈیشن)	"	۶/۸۰	
۴	سُریلی بانسری	"	۵/۱۵	
۵	نظامِ اردو	"	۳/۱۵	
۶۔	متفرقاتِ آرزو	"	۳/۶۰	

ملنے کا پتہ

اترپردیش اردو اکادمی، بلہرہ ہاؤس

قیصر باغ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

(فون نمبر ۴۳۱۴۲)

وصی احمد اخگر مرحوم

مقدمۂ فغانِ آرزو

شاعری تخیل و محاکات کی سحر پردازیوں کا نام ہے۔ فلسفہ ہو یا تصوف
تاریخ ہو یا افسانہ، حقائق ہوں یا معارف جب ان کی دلآرائیوں کے سانچے
میں ڈھل جاتے ہیں، دلاویزی ان کا کلمہ پڑھتی ہے، دلربائی ان کا دم بھرتی
ہے۔ نثر ہو یا شعر سب کی دلکشی کا راز یہ ہے کہ کہنے والا اس انداز سے کہہ جائے
کہ بے اثری کا نشان و اثر باقی نہ رہے۔ اگر شعر حالتِ انبساط میں کہا گیا ہے
تو اس میں یہ تاثیر ہونی چاہیے کہ روتا آدمی ہنس پڑے اور اگر حالتِ حزن و
ملال میں کہا گیا ہے تو بیحس سے بیحس آدمی بھی بیچین ہو جائے، جس محفل میں
پڑھا جائے اُسے ماتم کدہ بنا دے۔ شعر کی صفت یہ ہے کہ نثر میں اسی بات کو
اس سے بہتر بیان کرنے والا بیان کرے مگر وہ دلکشی و دلربائی پیدا نہ ہو کوئی
شعر کامل کہے جانے کا مستحق نہیں اگر وہ انسانی جذبات کو برانگیختہ نہ کر سکے
سامع پر وہی اثر نہ ڈال سکے جو مقصود تھا۔

اسی وجہ سے لکھنؤ کی شاعری پر دہلی والوں کا ایک زمانہ سے یہ اعتراض
ہے کہ یہ حضرات حسیات اور جذبات کے صحیح مصور نہیں، ان کے یہاں
صنعت لفظوں کی نمائش ہے۔ لفظوں کے گھروندے بنا بنا کر ان سے کھیلتے
ہیں۔ اثر نام کو نہیں۔ سب سے پہلے اس خیال کے بے بنیاد ثابت کر دکھانے

کا سہرا جناب میر انیس صاحب و جناب میرزا دبیر صاحب مرحوم کے سر رہا
ان کے بعد لکھنؤ میں ایسے حضرات بہت کم پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے کلام سے
یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ وہ شاعری کی شاہراہِ مستقیم پر چل رہے
ہیں۔ جن بزرگوں نے اپنی سلاست مذاق کے ڈنکے بجا دئے ان میں حضرت تعشق
بھی ہیں جن کے بیشتر اشعار میں اب تک شوریدگی پیدا کر دینے کی قدرت موجود ہے
آخر میں زمانہ نے ایک ایسا باخبر شخص پیدا کر دیا جو متاثر ہو جانے والا دل اور
متاثر کر دینے والی زبان لایا تھا۔ اس نے چالیس سال کی مشقِ سخن میں یہ ثابت
کر دکھایا کہ اساتذۂ لکھنؤ اگر چاہیں تو ہر رنگ پر قادر ہو سکتے ہیں۔ انھیں بزرگ
کے شاعرانہ پاکیزہ خیالات ہیں جو فصاحت کے سرچشمہ سے نکل کر دریائے
مواج کی طرح رواں ہیں۔ کدورت کا نام تک نہیں۔ زبان کا یہ حال ہے کہ سبحان اللہ
بالائی سطح پر نظر ڈالنے سے تہہ کے اندر ڈوبے ہوئے موتی جھلک دکھاتے ہیں۔ یہ
بزرگ کون ہیں؟ آرزو جانشین حضرت جلال لکھنوی۔

اس تاجدار اقلیم سخن کا نام نامی سید انور حسین عرف منجھو صاحب ہے آپ
سخنور معنی شناس میرزا کرم حسین صاحب یاس مغفور لکھنوی کے منجھلے صاحبزادے
ہیں۔ آپ کے جدِ اعلیٰ نواب سید جان علی خان صاحب المخاطب بہ نواب تہور خان
صاحب اپنے والد میر تہمام علی خان صاحب کے ہمراہ ہرات سے عہد شہنشاہ
اورنگ زیب عالمگیر میں وارد ہندوستان ہوئے اور اجمیر میں قیام کیا۔ آپ
سلطنت مغلیہ کے ایک رکن ہو کر بھی وہیں مقیم رہے۔ انھیں نواب تہور خان
صاحب کے پوتے نواب سیف الدین خاں صاحب المعروف نواب میرزا گل بیگ
صاحب اجمیر سے لکھنؤ آئے اور یہاں شان و شوکت سے اپنی زندگی بسر
کرنے لگے۔

غدر کے زمانہ میں لکھنؤ میں کس کا گھر نہ لٹا اور پرانے باشندوں میں کون تباہ نہ ہوا دولت لٹی، گھر جل گیا۔ ریاست بگڑ گئی۔ تسلط ہوا تو مفلسی اور فلاکت سے کام پڑا شہرت و اختیار کا دور ختم ہوا اور قناعت کے نظر کردہ گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے میرزا اکبر حسین صاحب جو نواب میرزا گل بیگ صاحب کے پرپوتے تھے زمانہ کے بدل جانے سے تلوار ہاتھ سے رکھ کر قلم اٹھا چکے تھے اور مادھو رام کی بارہ دری میں رہتے تھے۔ اسی بارہ دری میں ۱۸ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ کو ان کے گھر میں یہ چمکتا ستارا اترا۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ یہ گم کردگانِ راہ کے لیے چراغِ راہ ہوگا اور بھولے بھٹکوں کو راہ پر لگائے گا۔ جناب یاس نے خود با اقبال بیٹے کی ولادت کی تاریخ کہی۔ مادہ تاریخ یہ تھا۔ ع

بار دیگر شکر کردم از زباں

اُس وقت کا لکھنؤ آج کا سا لکھنؤ نہ تھا۔ ہر شریف گھر تمیز و تہذیب کا مخزن اور منبع تھا۔ گھر کا ہر بڑا بوڑھا یہ خیال مدنظر رکھتا تھا کہ خاندان کی منزلت کے اعتبار سے اپنے بچوں کی تربیت کرے۔ یہ چھوٹا مگر ہونہار بچہ بھی ایسے ہی بزرگوں کے آغوش تربیت میں پلتا اور سایۂ عاطفت میں کھیلتا تھا جب آپ پانچ برس کے ہوئے تو پڑھنے کے لیے بٹھائے گئے۔ ابتدا میں پڑھنے سے طبیعت بھاگتی تھی۔ کھیلوں کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ مگر اس ایجاد پسند اور جدت طراز طبیعت کا یہ حال تھا کہ ان کھیلوں میں بھی صنعت طرازی ہوتی تھی۔ اور نئے نئے ڈھنگ سے کھیل کا سامان تیار کیا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ مرغوب شغل کنکوا تھا۔ نئے نئے رنگ کے کنکوے بنتے تھے اور وہیں ایلچ خاں کے میدان میں ایسے ایسے میدان بچوں کے لڑتے تھے کہ دیکھنے والے بڈھوں کو اپنا زمانہ یاد آجاتا تھا۔ ایک لطیف بات یہ تھی کہ دوسرے ساتھی ان کو اُسی وقت سے استاد

کہتے تھے۔ پہچاننے والی نظروں نے فیصلہ کر دیا ہوگا کہ یہ لڑکا اس میدان ہی کا استاد نہیں خدا جانے کن کن صنعتوں میں کون کونسی ایجادیں کرے گا۔

اسی زمانہ میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ لہو ولعب سے طبیعت پھری اب اس نہ رکنے والے دریا کا بہاؤ پھر تعلیم کی طرف تھا۔ فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں میر قاسم علی صاحب سے پڑھیں اور اس کے بعد جو کچھ پڑھا وہ حضرت قدوۃ العلماء مولانا و مقتدانا سید آقا حسن صاحب مجتہد العصر والزماں سے۔

اب کوئی بارہ برس کا سن ہوگا کہ شعر کی طرف میلان طبیعت ہوا۔ گھر میں باپ اور بھائی میر یوسف حسن صاحب قیاس جو نو برس کے سن سے شعر کہتے تھے، موجود تھے۔ ان کو شعر کہتے دیکھ کر ان کی ہمہ گیر طبیعت کب رکتی تھی سب سے چھپا کر شعر کہنا شروع کیا۔ اسی زمانہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ جس کو ان کی شاعری کی بسم اللہ کہہ سکتے ہیں۔ ہوا یہ کہ ایک شاگرد کی غزل جناب یاس نے قیاس صاحب کو دی کہ اس کی اصلاح کر دیں۔ وہ اصلاح کی فکر میں ہیں اور یہ ان کے پاس موجود ہیں۔ انھوں نے بھی شعر پڑھا اور فوراً بولے — "بھائی صاحب اگر یہ شعر اس طور پر ہو تو کیسا ہے؟" قیاس صاحب نے ان کی صورت دیکھی اور شعر کو اسی طرح بنا دیا۔ انھوں نے پوری غزل یونہی درست کرا دی شام کو جب جناب یاس نے وہ غزل مانگی تو قیاس صاحب نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اصلاح شدہ غزل لا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ یاس صاحب نے اسی دن لے جا کر ان کو سر آمد شعرائے ماضی و حال جناب حکیم میر ضامن علی صاحب جلال مغفور کا شاگرد کرا دیا۔ اس وقت ان کا سن پورے تیرہ برس کا تھا۔

اُن دنوں اس شہر میں ذوق علم و ادب اب سے بہت زیادہ تھا۔ اور مذاق سلیم رکھنے والوں کی کمی ایسی نہ تھی جیسی اس وقت ہے اور نہ اہل فن کی

یسا دبازاری کا یہ عالم تھا۔ غواص معانی انمول جواہر نکال کر بازار سخن میں لائے
ور تحسین و آفریں کے منہ مانگے دام پائے۔ محلہ محلہ میں ماہواری مشاعرے ہوتے
تھے اور ایک عجیب عالم نظر آتا تھا۔ نومشقوں کے لیے یہ مشاعرے سب سے زیادہ
مفید اور سبق آموز تھے۔ حضرت آرزو نے بھی اسی میدان میں گامزنی شروع کی
ور اسی کو اپنا جولانگاہ بنایا۔ آپ نے سب سے پہلی غزل نواب منجھلے آغا صاحب
کے مشاعرہ میں پڑھی۔ انجمن میں نہیں، چمن میں نہیں۔ طرح تھی۔ جناب آرزو کی
زل اس مشاعرہ میں بہت چمکی اور استادوں نے یہ اندازہ کیا کہ کمال پر پہونچ
ر یہ ہونہار آسمان شعر کا چاند ہوگا۔ اسی غزل کے دو شعر میں لکھتا ہوں۔ اہل
وق دیکھیں گے کہ طبیعت کا زور کتنا ہے اور طرز ادا کیسا انوکھا۔

مطلع

ہمارا ذکر جو ظالم کی انجمن میں نہیں　　جبھی تو درد کا پہلو کسی سخن میں نہیں

یک اور شعر تھا ؎

شہید ناز کی محشر میں دے گواہی کون　　کوئی لہو کا بھی دھبہ مرے کفن میں نہیں

اس زمانہ کے لوگ بھی ایسے ہی ہوتے تھے کہ جہاں محلہ کا کوئی بچہ ہونہار معلوم
ا انھوں نے عجیب عجیب انداز سے اس کے دل میں امنگ پیدا کرنی شروع
دی تاکہ طبیعت لڑی رہے اور تھوڑے عرصہ میں وہ اپنے فن کے معراج کمال
پہونچ جائے۔ اسی طرز کے ایک بزرگ میرن صاحب نے آرزو صاحب کو
ب دن یہ مصرع۔

اڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

یا اور کہا کہ اگر دس برس میں بھی تم اس پر مصرع لگا دو تو میں تم کو شاعر مان لوں
باب آرزو نے فرمایا کہ دس برس تک زندہ رہنے کی امید یہاں کسے بھی نہیں

معلوم کہ ایک سانس کے بعد دوسری آئے گی بھی یا نہیں۔ میں ابھی کوشش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ مصرع لگ جائے۔ تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد اس مصرع کو مصرع دو یم کر کے ایسا مصرع لگا دیا کہ بے معنی مصرع معنی دار شعر کی شکل میں تبدیل ہو گیا ؎

دامن اس یوسف کا آیا پُرزے ہو کر ہاتھ میں
(طرح) اُڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

ابتدائی کیفیتیں دیکھ کر اکثر اساتذہ نے پیشین گوئیاں کیں کہ یہ لڑکا کسی وقت اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہوگا۔ ان جوہر شناس نظروں نے جو کچھ دیکھا تھا آگے چل کر وہی ہوا۔

ابتدا بہت زیادہ محنت سے اور کثرت کے ساتھ مشق کی اور بڑے بڑے معرکہ کے مشاعروں میں شرکت کی جن میں خصوصیت کے ساتھ امتیاز حاصل ہے۔

اس زمانہ کے مشاعروں کی غزلیں عموماً اپنے استاد ہی کے رنگ پر کہی ہیں۔ دیکھنے والے دیکھیں گے کہ رنگ جلالی کیسا نمایاں ہے اور طبیعت ہے کہ منہ زور گھوڑے کی طرح روکے نہیں رکتی۔ یہ ان کی مشق کا دور اول کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کی حالتِ مشق کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے کیا جا سکتا ہے ؎

مجھ کو میری روش مٹاتی ہے — پاؤں کی خاک سر پہ آتی ہے
چارہ گر سے چھپا رہا ہوں درد — بات کی کہ میں جان جاتی ہے
خودکشی کا آپ پر الزام دھرتے جائینگے — ہم تو مرتے ہیں مگر بدنام کرتے جائینگے
جانستاں تھی نگہ ناز کہ خالی نہ گئی — اس بہانے سے قضا آئی کہ ٹالی نہ گئی

دی ہے راحت کے بہانے مجھے ایذا کیا کیا چٹکیاں لیتے رہے پھانس نکالی نہ گئی

اِدھر بھی آنا اُدھر جانے والے ارے دل کے بیتاب کر جانیوالے

مرا سوگ کیسا تری شرم رکھ لیں یہ چہرہ یہ گیسو بکھر جانے والے

نہال ہو کے دلِ داغ دار دیکھیں گے خزاں تو آئے پھر اپنی بہار دیکھیں گے

ہے شمع ہاتھ میں چہرہ یہ زلف آنکھوں میں اشک اندھیری رات میں کس کا مزار دیکھیں گے

ابتدائی مشق کے ساتھ تحصیل فن عروض خاص طور پر جناب جلال سے کی گئی جس کی تکمیل پانچ سال میں جب جناب آرزو کا سن ۱۸ سال کا تھا ہو گئی استاد نے یہ دیکھکر کہ یہ شاگرد اب ایسا ہو گیا ہے کہ بڑھاپے میں کچھ ہاتھ بٹا سکے اسی سال اپنے چند شاگردوں کو ان کے سپرد کر دیا کہ ان کے کلام کی اصلاح کیا کریں۔ یہاں سے آرزو صاحب کی مشق کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اہل نظر دیکھیں گے کہ اس دور کا رنگ تغزل دور اول کے رنگ سے کتنا بالاتر اور علاحدہ ہے۔ یہاں سے اساتذۂ متقدمین کا تتبع شروع ہوتا ہے جس میں سے میر اور مومن کا رنگ سب پر غالب ہے اور اس پر کوئی دوسرا رنگ نہیں چڑھتا۔

دور دوم کے ابتدا کی کیفیت یہ تھی ؎

پھر مرے زہد کے ساماں پہ تباہی آئی قصد توبہ کا کیا تھا کہ جماہی آئی

اپنا بھی آہنگ ہر ایک صورت نے ایک ہے نغمہ بھی کرتے ہیں نالہ بھی مگر لے ایک ہے

قتال جہاں معشوق جو تھے، سونے ہیں پڑے مرقد ان کے

یا مرنے والے لاکھوں تھے، یا رونے والا کوئی نہیں

یوں آگ لگاتے پھرتے ہو کیوں جب گرم ہوا سے ڈرتے ہو

دل پہلے جلا کر خاک کیا اب ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہو

چارہ گروں کی کوشش راحت چرخ کی دل آزاری ہے

پھاہے کا، اپنے زخم جگر کے، مرہم تک زنگاری ہے

تازہ وہ پھرے ہو گئے غم تھے فلک نے جو دئے
جس نے کہ ہنس کے بات کی ہم بھی لپٹ کے رو دئے

میر و مومن کے تتبع کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے کلام میں حیرت ادا اور سوز و گداز کثرت سے پایا جانے لگا۔ ذیل کے اشعار اسی دور دویم کے آخری زمانہ کے تغزل کا نمونہ ہیں ؎

دو آنکھیں ہیں یا اک دل، انکا بھی یہ نقشہ ہے — وہ رستے ہوئے سغر، شیشہ یہ شکستہ ہے
متوالی وہ آنکھیں ہیں دو توبہ شکن ساغر — اور اُس پہ اشارے بھی بس توبہ ہی توبہ ہے

ہم آنکھیں کھولے بیٹھے تھے جب سارا عالم سوتا تھا
مانند چراغ اک سوختہ تن گہ ہنستا تھا گہ روتا تھا

میں خوش ہوں ختم مصیبت سے وہ چونکے ہیں اپنی غفلت سے
اب روتے ہیں میرے ہنسنے پر یا ہنستے تھے جب میں روتا تھا

کچھ کہتے کہتے اشاروں میں شرما کے کسی کا رہ جانا
وہ میرا سمجھ کر کچھ کا کچھ جو کہنا نہ تھا بس کہہ جانا

تلوار اٹھائی پھر رکھدی، ابرو پہ بل آیا لب پہ ہنسی
بس دیکھ لی یہ ٹھنڈی گرمی جلا دیتے اور ڈرتے ہو

رات مزے کی اور یہ غفلت — ساری جوانی سوتے گذری
کچھ تو بقائے حال کی تدبیر چاہیے — اک عالم جنوں کی بھی تصویر چاہیے
پیری بنی جوانی ایسوں کے داغ دیکھے — بجھتے سحر سے پہلے کیا کیا چراغ دیکھے

یہاں سے حضرت آرزو کا دور دویم ختم اور دور سویم شروع ہوتا ہے۔
چالیس برس کے سن سے اب تک (کہ بفضلہ ۵۴ برس کا سن ہے) کلام کا نمونہ پیش
کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ ایک ایسے واقعے کا ذکر کروں جس نے حضرت
آرزو کی شاعرانہ زندگی میں ایک تغیر پیدا کر دیا۔ علامہ جلال نے ۱۳۲۶ھ میں
انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے تلامذہ میں جانشینی کے لیے تجویزیں ہو رہی تھیں
کہ جناب نواب امراؤ بہادر صاحب ولیعہد خلف عالیجناب نواب علی بہادر صاحب
والئی باندہ لکھنؤ تشریف لائے۔ اساتذۂ لکھنؤ سے دریافت کیا کہ حضرت جلال
کے بعد ان کے شاگردوں میں ان کی قائم مقامی کے لائق کون ہے۔ سب نے
باتفاق حضرت آرزو کا نام لیا۔ اور آپ ۱۳۲۸ھ میں جانشین حضرت جلال مقرر
ہوئے۔ نواب صاحب موصوف نے بعد کو اساتذہ لکھنؤ کی تحریری رائے حاصل
کرنی چاہیے اور تقریباً اساتذۂ لکھنؤ نے اس محضر پر دستخط فرمائے۔ نواب بہادر حسین
خاں صاحب انجم نیشاپوری مرحوم نے جو ارشد تلامذہ جناب اسیر مرحوم میں سے
تھے اس واقعہ کی لاجواب تاریخ کہی۔ ع

آرزو شد رکن اعلا مسند آرائے جلال

اس میں شک نہیں کہ جناب جلال کے شاگردوں میں کثرت سے ذی مرتبہ
اور بلند پایہ شاگرد تھے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ ان کے بعد تاج سخنوری اگر
کسی سر پر موزوں معلوم ہو سکتا تھا تو وہ سر حضرت آرزو ہی کا تھا۔

حضرت آرزو کے کلام سے اوائل عمر ہی میں وہ کیفیتیں رونما ہونے لگی تھیں
جو بعض اساتذہ کے یہاں آخر عمر میں نمودار ہوتی ہیں۔ دور سویم میں مختلف رنگوں
میں قادر الکلامی حاصل ہو گئی۔ اسی زمانہ میں طبیعت ادا بندی، فلسفہ اور تصوف کی طرف
بہت زیادہ مائل ہوئی مگر محاورہ اور زبان کے معاملہ میں خدائے سخن میر کی پیروی

نہ چھوٹی۔ مشکل سے مشکل صوفیانہ اور فلسفیانہ مضامین کو ایسی صفائی اور روانی سے ادا کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ پیش پا افتادہ باتیں ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف جناب آرزو ہی کی پتھر کو پانی کر دینے والی طبیعت کا زور ہے کہ مشکل سے مشکل باتیں اتنی آسانی سے نظم ہو جاتی ہیں۔ وہی بندش ہے وہی طرز ادا، وہی کوثر میں دھوئی ہوئی لکھنؤ کی میٹھی زبان۔ فلسفہ اور تصوف کے حقائق بیان ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ کوئی میٹھا معمولی باتیں کر رہا ہے۔ نہ کوئی لفظ کانوں پر بار ہوتی ہے نہ کوئی چیز سمجھنے میں حائل ہے۔

فلسفہ اور تصوف کی چاٹ نے اس دور میں مرزا غالب مرحوم کا رنگ بھی پیدا کر دیا۔ مرزا غالب کو جو قبولیت عام حاصل ہے وہ ان کے فلسفیانہ مضامین، طرز ادا اور بلند خیال کی وجہ سے ہے۔ مرزا کی بلندی خیال کا یہ عالم ہے کہ ہر جگہ گویا آسمان سے تارے توڑتا ہے کہ ساتھ ہی ساتھ فارسیت کا اتنا زیادہ زور ہے کہ کہیں عجب عجب محاورے، عجیب عجیب ترکیبیں، کہیں مشکل بندشیں بعض اوقات مرزا کے شعر کو معمولی سمجھ سے بالاتر بنا دیتے ہیں۔ حضرت آرزو نے رنگ غالب کی پیروی صرف تخیل و طرز ادا میں کی ہے۔ زبان میں انداز میر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ غالباً یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر کوئی مرزا کی تقلید ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے کر سکتا ہے تو اتنی ہی۔ انھوں نے غالب کی اکثر غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ نقاد طبیعتیں ذیل کے چند اشعار سے اندازہ کر سکیں گی کہ ان میں کہاں تک مرزا کا رنگ جھلکتا ہے ؎

دوست نے دل کو توڑ کر نقش وفا مٹا دیا
سمجھے تھے ہم جسے خلیل کعبہ اسی نے ڈھا دیا

خوں شدہ دل اگر نہیں پھر ہے یہ اشک سرخ کیا

اب بھی نہ تم یقین لاؤ۔ آنکھ سے تو دکھا دیا

نالے ہیں دلستاں تو پھر آہیں ہیں برچھیاں تو ہوں
ہم تو خموش بیٹھے تھے آپ نے کیوں ستا دیا

تابع شوق بھی ہیں ہم ان کے بھی ہیں مزاج داں
سوچ کے خط میں کچھ لکھا۔ آپ ہی خود مٹا دیا

بیٹھا ہوں اپنے قتل کا ساماں کیے ہوئے
یعنی خیال ناوک مژگاں کیے ہوئے

تکتا ہوں سوئے پردۂ در بن کے اجنبی
شوقِ نظارہ آنکھوں میں پنہاں کیے ہوئے

یوں پھر رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں
آلودہ میرے خون میں داماں کیے ہوئے

وحشت ہم اپنی بعد فنا چھوڑ جائیں گے
اب تم پھرو گے چاک گریباں کیے ہوئے

جوشِ جنوں میں وہ ترے وحشی کا چیخنا
بند اپنے ہاتھ سے در زنداں کیے ہوئے

یوسفستانِ محبت کا حسد یاد آ گیا
اور دل ٹوٹا جو بھیکر بھائی سے بھائی ملا

نشست عارضی سے ہے سرائے دہر کی رونق
یہ ہے اک کارواں جس پر جمی محفل کا دھوکا ہے

آتش غم سے بن کے زبان بھی شعلۂ بے آواز تھے ہم
خاموشی میں سمٹا دی ہستی کیونکہ سراپا راز تھے ہم

اداؤں سے ولولے نمایاں کچھ اس طرح قتل عام کے ہیں
کہ اختیارات جیسے حاصل جفائے بے انتقام کے ہیں

عجب طرح یہ دل افسردگی میں جلتا ہے
کہ سانس لینے میں ٹھنڈا دھواں نکلتا ہے

زبان اردو پر حضرت آرزو کا خاص احسان یہ ہے کہ آپ نے بہت سے ایسے

الفاظ جو زبان اردو کی جان ہیں اور سلاست و فصاحت کا ایمان اور جن کو زمانہ کی بدمذاقی نے نابود کر دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ آرزو نے ان کو کشتگان بے گناہ کے ساتھ مسیحائی کی۔ پھر سے خلعتِ حیات عطا کی اور یوں ان لفظوں سے کام لیا کہ فصاحت نے بارک اللہ اور بلاغت نے اللہ اللہ کہا۔ جہاں پر ایسے الفاظ رکھ دیے معلوم ہوا جواہر جڑ دیے ہیں اور یہی وہ شاعری ہے جس پر لکھنؤ جہاں تک ناز کرے بجا ہے۔ اوپر کے اشعار میں خط کشیدہ ترکیبیں اس کا نمونہ ہیں۔

میں نے شروع میں ذکر کیا ہے کہ اس دور میں ادا بندی بھی کثرت سے پیدا ہو گئی۔ مرزا داغ مرحوم نے ادا بندی اپنا حصہ کر لیا تھا۔ ذیل کے چند اشعار مرزا کی ادا بندیوں کا جواب ہیں ؎

بھری جوانی امنگ کے دن لڑیں نگاہیں کہ فیصلہ ہے
بخیر انجام ہو الٰہی، یہ دل کا پہلا معاملہ ہے

نہ دے ٹھوکے نگاہ ناز اب سنبھل سکیں گے رند مشرب
پیالہ ہے اس طرح لبالب کہ ہاتھ کانپا تو فیصلہ ہے

ادا سے بل تیوریوں پہ لانا بجا بجا کہہ کے مسکرانا
شکایت اس طرح سن رہے ہیں کہ جیسے انکو بھی کچھ گلہ ہے

یہ آرزو شیب کا زمانہ اور اس پہ اشعار عاشقانہ
بجھی ہوئی آگ کی ہے تیزی پسے ہوئے دل کا ولولہ ہے

خصوصیات شعر میں سے کونسی خصوصیت ہے کہ حضرت آرزو کے کلام میں موجود نہیں۔ ندرتِ محاورات، جدتِ ادا، الفاظ کا دروبست، سلاست روانی سب کے سب بدرجۂ اتم موجود ہیں مگر سب سے زیادہ نمایاں چیز جو ہر نظر

کو محسوس ہوتی ہے وہ خوبیٔ زبان ہے۔ کیسی ہی سنگلاخ زمین، کتنی ہی بے مزہ
ردیف قافیہ مگر ان کی ہمہ گیر طبیعت زبان کے جوہر دکھلا کے رہتی ہے۔ یوں کہنا
بیجا نہ ہوگا کہ سہل ممتنع پر جو قدرت حضرت آرزو کو ہے دوسرے لوگوں میں کم ہوتی
ہے۔ فن عروض پر جو تبحر اور زبان اردو پر جو قدرت آرزو صاحب کو حاصل ہے اس
کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے طالبان علم و فن ہندوستان کے مختلف حصوں سے حلقہ
تلامذہ میں داخل ہوئے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہے جن میں
سے بعض بعض نے دنیائے ادب میں اپنا سکہ جما دیا ہے۔

بعض حضرات کو یہ تعجب ہوگا کہ جس استاد کے اتنے شاگرد ہوں وہ ان
کے کلام کی اصلاح کیونکر کر سکتا ہے مگر یہ بات ان حضرات کی سمجھ میں آسانی سے
نہیں آسکتی جنھوں نے حضرت آرزو کو اصلاح دیتے نہیں دیکھا ہے۔ پندرہ
بیس شعر کی غزل درست کرنے میں حضرت آرزو کو کبھی دس منٹ سے زیادہ کی
ضرورت نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مشاعرہ میں جا رہے ہیں اور کوئی
شاگرد آپہونچا جس کی غزل اس وقت تک بنی نہ تھی مشاعرہ کو چل کھڑے ہوئے
اور راستہ میں غزل بن گئی۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ عین مشاعرہ کے دن
پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح ہوئی ہے۔ ان کے بعض
ہمعصروں کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ یہ اتنی غزلیں ایک وقت میں درست کر سکتے
ہیں مگر اتفاقاً ایک مرتبہ سندیلہ میں جب ان کی موجودگی میں انھوں نے بات کی بات
میں بیسیوں غزلوں پر اصلاح دے دی۔ تب ان حضرات کو یقین ہوا اور ان کے
کمال کے قائل ہوئے۔ ان حضرات نے خود ہی جناب آرزو سے اس کا تذکرہ فرمایا تھا۔

مجھے افسوس ہے کہ مقدمہ کے طویل ہو جانے کے خوف سے میں اصلاح کی
کچھ مثالیں ناظرین کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ اگر زمانہ نے مہلت دی تو

راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ ایک مفصل رسالہ حضرت آرزو کی اصلاح پر ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا سکے گا۔

آرزو صاحب نے جس آغوش میں تربیت پائی تھی اس کا نتیجہ قطعی وہی ہونا چاہیے تھا جو ہوا۔ طبیعت میں ایک طرف تو حد درجہ کی انکساری نے فروتنی اور دوسری طرف قناعت اور استغنا نے کار دنیا سے بے تعلقی پیدا کرا دی مگر آپ کی زندگی کا زریں اصول ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ کسی ذی روح کو رنجیدہ کرنا انسان کے بدترین افعال میں سے ہے۔ جو شخص آپ سے ایک مرتبہ بھی مل لیا ہے وہ حسنِ اخلاق کا شیدا و فریفتہ ہو گیا ہے۔

انسان کے اخلاق و عادات کا اثر ہمیشہ اس کی تصانیف پر پڑتا ہے۔ ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ جس شخص کو دنیا کے کاموں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں وہ اہل دنیا کی تعریف میں بھٹی کیوں کرنے لگا اسی خلقی اثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرزو صاحب کا کلام خواجہ آتش کی طرح اہل دنیا کی تعریف سے بالکل پاک ہے۔ اپنے بزرگانِ دین کے سوا کسی کی تعریف میں کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ غزلیں اس کثرت سے کہی ہیں کہ تین دیوان موجود ہیں۔ جس میں سے پہلا زیور طبع سے اب مزین ہوا ہے۔

مثنویاں بھی کئی لکھی ہیں جس میں سے عدل محمود اور صبح بنارس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

قطعات و رباعیات و سلام بہت کثرت سے کہے ہیں۔ اتحاد ہنود و مسلم، اسلام کی ابتدائی حالت اور جنگ یورپ پر جو قطعات آپ نے لکھے ہیں وہ طبع ہو کر اہل سخن کی پسندیدگی حاصل کر چکے ہیں۔ اور خیال ہے کہ آئندہ دو علاحدہ علاحدہ رسالوں کی صورت میں شائع کیے جائیں گے۔

مرثیہ گوئی کا مذاق چونکہ موروثی تھا اس لیے غزلیات کے بعد سب سے زیادہ تعداد میں مراثی کہے ہیں مگر چونکہ طبیعت ہمیشہ سے جاہ پسندی سے بھاگتی رہی ہے اور اسلیے کہ اسے ذریعہ معاش بھی نہیں بنایا۔ اس صنف میں امتیاز حاصل کرنے کا شوق نہ ہوا البتہ اس خاص صنف میں ان کے شاگردوں میں سے بعض نے کافی ناموری پیدا کی ہے۔

نثر لکھنے کا شوق تھوڑے زمانہ سے پیدا ہوا ہے اور بعض دیرینہ احباب کے اصرار سے آپ نے پانچ ڈرامے۔ متوالی جوگن۔ دل جلی بیراگن۔ شرارہ حسن۔ جام زہر اور صدائے درویش جو سب کے سب اوریجنل پلاٹ پر لکھے ہیں مگر ان سب تصانیف سے بالاتر حضرت آرزو کا وہ چھوٹا رسالہ قواعد زبانِ اردو پر ہے جس کو موصوف نے بیس سال کی محنت شاقہ کے بعد حال ہی میں ختم کیا ہے اس میں الفاظ زبان اردو کے استعمال بالمحل پر بحث کی گئی ہے۔ یہ ادبیات اردو میں ایک خاص قسم کا اضافہ ہے اور حضرت آرزو اس کے متعلق فخریہ طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؎

حاصل عمر نثار رہ یار کردم شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

امید ہے کہ چند مہینوں کے انتظار کے بعد یہ رسالہ بھی ناظرین کے پیش نظر ہوگا۔

رسالہ میزان الحروف

دیباچۂ مصنّف

علمِ عروض میں حرکات و سکوناتِ حروف کی مفرد ترتیبوں اور مرکبہ ہیئتوں سے بحث کی
ئی ہے لیکن خود حروف کی میعادِ صوت یا یوں کہیے کہ مقدارِ آواز سے کبھی بحث نہیں کی گئی،
س سے یہ اندازہ ہو سکے کہ کس حرف کی آواز کتنی ہے۔ تاکہ وہ تلفظ کے وقت کم و بیش نہ
نے پائے جس سے وزن باطل ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ذوقِ فطری سے محروم
ں۔ اگرچہ علمِ عروض سے بے بہرہ نہ ہوں وہ بھی موزوں کلام کو موزوں پڑھنے سے قاصر
ہتے ہیں۔ کیوں کہ کہیں حرکت کے اتباع سے حرف پیدا ہو کر تعداد مقررہ میں حرف
ڑھ جاتا ہے۔ کہیں سکونات کے بے محل گھٹنے بڑھنے سے ان کا نظامِ ترتیبی بگڑ کر وزن میں
ق ڈال دیتا ہے۔ اس رسالے میں اسی عقدے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس
ف کی آواز کتنی ہے اور سمجھانے کے لیے مثالیں بھی اوزان عروض ہی کے مفرد و مرکب اجزا
ے لائی گئی ہیں کہ کلام موزوں کو موزوں بہ سے مطابق کر کے جانچ لینے میں دشواری نہ ہو۔

چوں کہ یہاں موضوع بحث حروف کی مقدارِ آواز ہے، اس لیے نام ان اصول کا "علم
دار الحروف" اور نام اس رسالے کا "میزان الحروف" رکھ دیا ہے۔ یہ اختراع علاحدہ کوئی
نہیں بلکہ اسی علمِ عروض کا ایک ضروری شعبہ ہے، جسے علمائے علمِ عروض نظر انداز کرتے چلے
ے ہیں۔

ناچیز
آرزو

حقیقتِ حروف

حرف اس تحریری شکل کا نام ہے جو مفرد آواز کی نوعیتِ صوت کو پہچنواتی ہے
آوازیں مختلف ہوتی ہیں۔ اسی لیے ہر حرف کی شکل بھی جداگانہ ہوتی ہے کہ آوازوں کو ز
باہمی کے ساتھ سمجھنے میں آسانی ہو۔

حروف، حرف کی جمع ہے جن کی تعداد اردو کے لیے ۳۸ ہے کہ ہندی حروف ہ
حروفِ فارسی و عربی بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ سب حروفِ "ہجا" کہلاتے ہیں۔

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش
ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ھ ء ی ے۔

اگر واؤ میں بھی معروف و مجہول کا فرق دکھانے کے لیے کوئی شکل معین ہو جا
تو پھر ۳۹ ہو جاتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ جو حروف آپس میں ہم آواز ہیں جیسے ا ع، ت ط، ت
ط، ث س ص، ذ ز ض ظ، اگر ان میں سے ایک ہی حرف لے لیا جائے اور با
حروف کو کتابت سے خارج کر دیا جائے جیسے "الم، علم" دونوں کو الف سے لکھ
جائے اور یہی صورت زکی، ذکی، نذیر، نظیر، یا سریر، صریر، تیار طیار سب
اختیار کی جائے تو جن لفظوں کے معنی کا فرق جو حروف ہی سے سمجھا جاتا ہے کیوں کر سمجھ
میں آئے گا۔ لہذا کل حروف کا رہنا ضروری ہے۔

حروفِ ملفوظی غیر مکتوبی

بعض آوازیں مکتوبی آوازوں سے مشابہ ہوتی ہیں مگر حرف کی صورت نہیں اختیا

تیں۔ یہ حرکت کے اشباع سے پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے "لہ"، "کا واو"، "بہ"، "کی ی" یا تنوین کا نون"

لیکن تقطیع شعر کے وقت اور حرف قافیہ ہونے کی صورت میں ان کو بھی مکتوبی نالیا جاتا ہے کہ کلام موزوں کو موزوں بہ سے مطابق کرنے میں آسانی ہو۔

مکتوبی غیر ملفوظی

بعض حروف کتابت میں آتے ہیں مگر ملفوظ نہیں ہوتے۔ جیسے "السلام" کا لام اول بعض حروف مکتوبی ہوتے ہیں مگر کبھی تو تلفظ میں آتے ہیں اور کبھی نہیں آتے ہیں۔ جیسے واو عاطفہ اور ہائے مختفیہ۔

جن آوازوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے اُن کی کوئی مکتوبی شکل بھی نہیں ہوتی۔

حرکات و سکونات حروف

جس طرح حروف سے آوازوں کی نوعیت پہچانی جاتی ہے، اسی طرح حرکات و سکونات سے آوازوں کی شان پہچانی جاتی ہے۔

حرکتیں تین ہیں: فتحہ، کسرہ، ضمہ۔ انھیں کو زبر، زیر، پیش بھی کہتے ہیں۔ اگر حرف کی آواز اوپر بڑھتی ہے تو حرکت کو فتحہ اور حرف کو مفتوح کہتے ہیں اور اگر حرف کی آواز نیچے جھکے تو حرکت کو کسرہ اور حرف کو مکسور کہتے ہیں اور اگر حرف کی آواز آگے کو جھکے تو حرکت کو ضمہ اور حرف کو مضموم کہتے ہیں اور جس حرف پر کوئی حرکت نہ ہو اس کے لیے لازم ہوگا کہ حرف ماقبل سے مل کر آواز دینے میں اسی کی حرکت کا تابع رہے۔ ایسے حرف کو ساکن کہتے ہیں۔ جیسے خم کی میم، دن کا نون، شر کی رے ساکن اور ہر پہلا حرف مفتوح، مکسور، مضموم ہے اور تعدد کے وقت دوسرے سواکن موقوف کہے جاتے ہیں۔

اجتماع حرکت و سکون

بعض کلموں میں ایک ہی حرف پہلے ساکن پڑھا جاتا ہے پھر متحرک۔ ایسے حرف کو مشدد کہتے ہیں، جیسے "چتّا" کی "تے" "گنّا" کی "نون"۔

نشانات حرکات و سکنات

حرکات کا نشان ایک آڑا خط ہے (ر) اگر حرف کے اوپر ہو تو "فتحہ" اور

حرف کے نیچے ہو تو "کسرہ" کہا جائے گا اور اگر حرف دار "واؤ" کا ہم شکل (و) کے اوپر ہو تو ضمہ کہلائے گا۔

سکونات کا نشان (و) حرف دال کے مشابہ ہے جو حرف کے اوپر ہوتا ہے جسے جزم کہتے ہیں اور اجتماع حرکت و سکون جس حرف پر ہو اس کا نشان (ں) یہ ہے جسے تشدید کہتے ہیں۔

حرکات و سکونات کے جو نشانات بتائے گئے ہیں اُن کا رواج عربی زبان میں تو پابندی کے ساتھ موجود ہے مگر اردو میں جہاں ضرورت سمجھی جاتی ہے وہاں دے دیے جاتے ہیں کہ غلط فہمی نہ ہو۔ جیسے اُس اور اس میں پیش اور زیر یا "گنا" میں تشدید نون کہ ایک ہی حرف ساکن بھی ہے، مفتوح بھی۔ مگر گنا میں اس علامت کی ضرورت نہیں کہ یہاں دو (ن) ہیں۔

القاب حروف

حرکت و سکون کے اعتبار سے حروف کے تین نام ہوتے ہیں۔ متحرک، ساکن، مشدد۔ تینوں قسم کے حروف اپنی نوعیتِ صوت بھی ظاہر کرتے ہیں اور مقدارِ آواز بھی پورے طور پر علاحدہ علاحدہ بتاتے ہیں۔ لیکن بعض حروف خفت کے ساتھ ملفوظ ہوتے ہیں جو صرف نوعیت صوت تو ظاہر کرتے ہیں مگر میعادِ صوت میں وہ حرفِ ماقبل کے ساتھ شامل ہو جایا کرتے ہیں اس لیے وہ باعتبار تلفظ حروف میں شمار نہیں ہوتے۔ تقطیعِ شعر کے وقت ایسے حروف ساقط کر دیے جاتے ہیں۔ یہ حروف کئی طرح کے ہوتے ہیں جن میں:۔

۱۔ نونِ غنہ ہے جو 'ہنس' میں ہے۔

۲۔ ہائے مخلوطہ ہے جو 'گھر' میں ہے۔

۳۔ واؤ اظہارِ ضمہ ہے جو خوش، خواہش، سوانگ وغیرہ میں آتا ہے۔

۴۔ یائے اظہارِ کسرہ جو درمیان میں بھی آتی ہے جیسے پیاس، بیاہ، کیا، کیوں وغیرہ میں ہے۔

شعرائے ہندی کلموں سے ان تینوں حرفوں (الف، واو، یے) کا گرنا جائز کر دیا ہے کہیں اصل یہ ہے کہ گرنا صرف اُنھیں حروف کا جائز ہے جن کا اظہار ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ یہ شان صرف واوِ مجہول اور یائے مجہول میں اکثر جگہ پائی جاتی ہے

جیسے جو، تو کا واؤ یا "اٹھ کے چلے گئے ہیں" کے کی "یے" کہ ان کا اظہار بھی ہائے مختفیہ فارسی کی طرح غیر فصیح ہے۔ ہم ایسے حروف کو حروفِ اشمام حرکات کہہ سکتے ہیں۔

الف، واو اور یائے معروف کسی طرح قابلِ اسقاط نہیں کہ ان میں حرفِ مستقل کی شان ہے اور ان کا گرنا کانوں کو بھی ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر تکرار ہو تو حرف کا گرنا ناگزیر ہو جاتا ہے جیسے "اپنا اپنا" اور "نفسی نفسی" میں پہلے "اپنا" کا الف آخر اور پہلی "نفسی" کی یائے معروف کہ لہجہ دوہری کشش قبول نہیں کرتا۔

ترتیب حروف

• کلمے کا پہلا حرف سوا متحرک کے ساکن ہو ہی نہیں سکتا جب کہ حروف کا اظہار حرکت کے تابع ہے اور آخری حرف سوا ساکن کے متحرک نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ ختم پر وقفہ لازم آتا ہے۔

اگر کسی کلمے کا آخر حرف ساکن نہیں بھی مانا جاتا ہے تو آخر میں حرکت کی مناسبت سے ایک حرف بڑھا کر لکھ دیتے ہیں۔ جیسے 'ہمہ' میں ہائے مختفی اور 'جو'، 'تو' میں واؤ۔

درمیانی حروف متحرک اور ساکن، دونوں ہوتے ہیں۔ حرف مشدّد درمیانی حرف ہے۔ اوّل میں تو آ ہی نہیں سکتا کہ وہ پہلے ساکن پڑھا جاتا ہے پھر متحرک اور آخر میں بھی سوا الفاظِ عربی کے نہیں آتا ہے جیسے 'حیّ'، کی 'یے'۔ زیر بحث یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ حرف الف کبھی کلمہ کا پہلا حرف نہیں ہو سکتا کہ وہ قبولِ حرکت سے عاجز ہے اور ابتدا بہ سکون محال ہے اور آخر حرف ہمزہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قبول سکون سے الف بن کر اپنی ہستی کو کھو دے گا اور جو بہ صورت الف کلمہ کے پہلے آیا کرتا ہے وہ الف نہیں ہمزہ ہے۔

اجتماع حروفِ متحرک

اردو زبان کے کسی کلمہ میں متحرک حروف برابر دو سے زیادہ، سوا بعض عربی کلمات کے نہیں آتے۔ جیسے خَفَقَان، رَمَضَان، عَظَمَت وغیرہ، تو یہ بھی عام طور پر سکونِ دوم ایمان اور غفلت کے وزن پر بولے جاتے ہیں کہ توالی حرکات دو سے زیادہ ہونا اردو کے لہجے پر بار

معلوم ہوتا ہے

اجتماع حروف ساکن

اسی طرح ساکن حروف بھی اردو میں دو سے زیادہ ایک ساتھ پائے تو جاتے ہیں مگر مقدارِ آواز میں دو ہی رہتے ہیں جیسے 'خواستگار' میں 'خواست' جس کے الف، س، ت میں آخر کے دونوں حرف ایک حرف کے برابر سمجھے جاتے ہیں۔ وزن 'خواستگار' کا بھی وہی ہے جو 'آشکار' کا ہے۔

اجتماع حروفِ مخلوطہ

مخلوطہ حروف بھی ایک کلمے میں دو سے زیادہ جمع نہیں ہوتے جو کبھی تو بے فاصلہ آتے ہیں جیسے "پھنس" اور "دھنس" میں ھ اور ن اور کبھی کوئی مستقل حرف درمیان میں ہوتا ہے جیسے جھانجھ، جھونجھ وغیرہ میں۔ کہیں الف درمیان میں آگیا ہے، کہیں واؤ بلکہ یہی الف، واؤ، یے، اکثر درمیان میں آیا کرتے ہیں۔

غرض کہ حروفِ مخلوطہ کہیں حروف میں شمار نہیں ہوتے کہ صرف نوعیتِ صوت ان سے ظاہر ہوتی ہے میعادِ صوت سے وہ ہر جگہ محروم ہوتے ہیں۔ اس لیے چہار حرفی کلمے پھنس اور دھنس دو حرفی، بس اور دس کے برابر سمجھے جاتے ہیں اور پنج حرفی، سانٹھ، گانٹھ وغیرہ۔ سات، بات سہ حرفی کلموں کے برابر شمار ہوتے ہیں۔

ان تشریحات سے یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ کون کون سے حروف میعادِ صوت کے حامل ہیں اور کون کون سے حروف میعادِ صوت سے محروم، صرف نوعیتِ صوت کو ظاہر کرتے ہیں۔

اس وقت زیرِ بحث حروف کی مقدار آواز ہے اس لیے حروفِ مخلوطہ اور مکتوبی غیر ملفوظی بحث سے خارج ہیں۔ زیرِ بحث صرف حروفِ متحرک اور وہ حروف ساکن ہیں جو نوعیتِ صوت کے ساتھ میعادِ صوت کے بھی حامل ہوتے ہیں اور مستقل حروف ہیں، ان میں کس حرف کی مقدار آواز کس محل پر کتنی ہے۔ مگر اس فرق کو سمجھانے کے لیے اوزانِ اشعار کے نظامِ تربیتی کا بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ بغیر اس کے افہام و تفہیم ناممکن ہے۔

نظامِ ترتیبات

عروضیوں نے اوزانِ اشعار کی بنیاد حرکات وسکونات حروف کی خوش گوار ترتیبوں پر رکھی ہے جن کی مفرد شکلیں تین ہیں: کلمات دو حرفی، سہ حرفی، چہار حرفی، ساکن الآخر جیسے دَم، قدم، بقدم ان کو سبب وتد اور فاصلہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ پھر ان اجزاے مفردہ کو باہم مخلوط کر کے پنج حرفی اور ہفت حرفی شکلیں مشتقاتِ فعل سے قائم کی ہیں اور انھیں ارکان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ پنج حرفی دو: فعولن فاعلن اور ہفت حرفی پانچ: متفاعلن، مفاعلتن، مفاعیلن، مستفعلن، فاعلاتن ہیں۔ بعد اس کے ان میں سے ہر ایک رکن کی تکرار سے ایک ایک بحر اس طرح معیّن کی ہے کہ اگر چار رکن کی تکرار سے وزن قائم کیا ہے تو بیچ میں وقف دے کر اس کے اعادے سے تعیّن ارکان کی تصدیق کر کے اسے بحر قرار دیا ہے۔ یعنی وزن مصدّق کا نام بحر رکھا ہے مثلاً فعولن، فعولن، فعولن، فعولن، وزن قرار دیا تو پھر اسی کو دہرانے کے بعد اس کا نام بحر متقارب رکھا۔ یوں ہی فاعلن" سے بحر متدارک" متفاعلن" سے بحر کامل" مفاعلتن" سے بحر وافر "مفاعیلن" سے بحر ہزج" مستفعلن" سے بحر رجز اور" فاعلاتن" سے بحر رمل بنا ڈالی۔ ترتیبات میں دو ساکنوں کا اجتماع کہیں نہیں ہے۔

اس محل پر سمجھنے سمجھانے کے لیے اتنا ہی بیان کیا گیا ہے جس کی یہاں ضرورت تھی۔

اجزاے مفردہ کی دوسری قسمیں سبب ثقیل، وتد مفروق، فاصلہ کبریٰ کو اور ان ارکان کو جن میں یہ اجزا شریک ہیں اردو کے لیے غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا۔ تفصیلی بیان ان کا رسالہ عروضِ اردو میں آئے گا۔

اصواتِ حروف میں تفریقِ تماری

حرفِ متحرک کی میعادِ صوت ہر جگہ اسی قدر ہے کہ دوسرا حرف پیدا نہ ہونے پائے۔ کیوں کہ حرکت اپنی حد سے تجاوز کر کے حرف کی صورت اختیار کر لیتی ہے مثلاً رکن فعلن میں اگر فتحۂ ف بڑھے گا تو الف پیدا ہو کر فاعلن

ہو جائے گا اور کسرۂ ع بڑھے گا تو یے پیدا ہو کر فَعِیلُن ہو جائے گا اور اگر ضمۂ ل بڑھے گا تو و پیدا ہو کر فَعُلُون ہو جائے گا اور اگر بہ یک وقت تینوں حرکتیں حد سے تجاوز کریں گی تو چہار حرفی کلمہ ہفت حرفی بن کر فاعی لُون ہو جائے گا۔ یہ ہے حرفِ متحرک کی میعادِ صوت جو کسی جگہ کم و بیش نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا سواکن کی میعادِ صوت جانچنے کے لیے ہم اُسی کو میعاد قرار دیتے ہیں۔

حرف ساکن کی میعادِ صوت اس کے محل وقوع کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے جو کہیں حرف متحرک سے کم ہوتی ہے، کہیں برابر اور کہیں زیادہ۔ یہیں سے سکونات کی تین قسمیں ظاہر ہوتی ہیں:۔ (۱) سکونِ صغیر (۲) سکونِ مساوی (۳) سکونِ کبیر۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر سہ سکونات میں سے ارکان بحور میں کس سکون کے لیے کون سا محل ہے۔

تنظیم سکونات

محل سکونِ صغیر

سکونِ صغیر کا محلِ وقوع وہ حرف ہے جو رکن میں سواکن کا ابتدائی یا درمیانی حرف نہ ہو۔ حرف آخر نہ ہو جیسے فاعلن۔ فاعلاتن کے الف۔ فعولن کا وَ۔ مُس۔ تف۔ علُن کے سَ اور تَ۔

ان حروف کی میعادِ صوت حرف متحرک سے اس لیے کم ہوتی ہے کہ یہ محل خلط اجزا کا ہے۔ یعنی اجزا کے جڑ جاذ سے ایک رُکن ایسا بنے کہ اس مرکب میں مفرد کی شان پیدا ہو جائے۔ اور یہ بات سواکن مذکور کی میعادِ صوت کم کیے بغیر ممکن نہیں اور اگر اس کے خلاف ہوگا تو مرکب کا ہر جزو الگ الگ نظر آئے گا جس سے مفردات کی وضاحت مرکب کے استقلال میں خلل انداز ہو کر نظامِ ترتیبی کو درہم برہم کر دے گی۔

محلِ سکونِ مساوی

سکونِ مساوی محل وقوع وہ حرف ہے جو رُکن کے اجزائے ترکیبی کا ابتدائی یا درمیانی حرف نہ ہو بلکہ آخر رُکن ہو اور خود وہ رُکن ارکانِ بحر کا رکنِ آخر نہ ہو۔ جیسے مفاعیلن یا کسی رُکن کا بھی حرف آخر۔

یہاں حرفِ ساکن کی میعادِ صوت، حرفِ متحرک سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتی کہ
ں خلطِ اجزا کا نہیں بلکہ تفریقِ ارکان کا ہے۔ اگر یہاں بھی سکونِ صغیر کو دخل
جائے گا تو ضروری تفریق مٹ جائے گی اور اجزائے ارکان آپس میں ایسے
ط ملط ہو جائیں گے کہ ان کی ہیئتِ ترکیبی بگڑ جائے گی، ایک رُکن کا جزو دوسرے
ں شامل ہو جائے گا اور دوسرے کا تیسرے میں۔ یہاں تک کہ بحر کی اصلیت
ہو جائے گی۔

ں سکونِ کبیر

سکونِ کبیر کا محلِ دخل وہ حرف ہے جو اوزانِ بحور میں اس کے ہر حصے کا حرفِ
ہو۔

یہاں سواکن کی میعادِ صوت کا حرفِ متحرک سے زائد ہونا اس لیے ضروری
کہ یہ محل تفریقِ ارکان کا نہیں بلکہ تقسیمِ اوزان کا ہے۔ مثلاً رکن فعولن کو چار
نبہ زبان پر لانے کے بعد اگر رکنِ آخر کے ساکن آخر میعادِ صوت دوسرے سواکن
ے زیادہ ہو گی تو صاف ظاہر ہو گا کہ ایک حصہ تعینِ ارکان کا ختم ہو گیا اور پانچویں
ں سے اسی کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا اور دونوں حصے وزنِ مصدق مان کر بحر کا
م 'متقارب ثمن الارکان' مان لیا جائے گا۔ برخلاف اس کے اگر حرفِ آخر پر
ا توقف نہ ہوا کہ ایک حصہ دوسرے حصے سے علاحدہ معلوم ہو تو آٹھوں رکن
ے سلسلے کی کڑیاں سمجھے جائیں گے اور بحر کا نام 'متقارب ثمن مضاعف' ماننا
ے گا۔

غرض کہ تقسیمِ اوزان سے تعدادِ ارکان کا ظاہر کرنے والا سکونِ کبیر ہی ہے
ں کی میعادِ صوت کم سے کم اتنی ہونا چاہیے کہ اگر ایک حرف علاحدہ سے شامل کر دیا
ے تو کھپ سکے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا۔

ور میں تعدادِ ارکان

یوں تو ہر بحر میں سمجھانے کے لیے ارکان کی تعداد مُعیّن کر دی گئی ہے مگر دراصل
کان کا تعین شاعر کے ذوقِ ارادی کے تابع ہے۔ وہ ایک مصرع چاہے جتنے ارکان

کا قرار دے لے۔ بعض شعرا نے، جن میں سید انشا بھی شامل ہیں، ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جن کا ایک ایک مصرع تعدادِ ارکان میں متعدد اشعار کے برابر ہے اور ہر مصرع کو ایک سانس میں پڑھ جانا قریب بہ محال ہے۔ کیوں کہ مصرع تو قافیے پر پہنچ کر ختم ہو گا مگر سانس بیچ ہی میں ٹوٹ جائے گی اور قہری طور پر سکون کہیں درمیان میں آ کر مصرع کو ٹکڑے کر ڈالے گا جس سے نظم نثر رجز بن کر رہ جائے گی۔

سید انشا نے مصحفی کی ہجو میں جو اشعار بحر "رمل مجنون" میں کہے ہیں ان میں کا ایک مصرع مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ع

بخداوندیِ ذاتے کہ رحیم است و کریم است و حلیم است و عظیم است و سلیم است و قدیم است و شریف است و لطیف است و خبیر است و بصیر است و نصیر است و کبیر است و رؤف است و غفور است و شکور است و ودود است و مرا خلق نمود است و بود خالقِ آفاق قسم می خورم اکنوں کہ مرا ہیچ زہجو تو سروکار نہ بود است و لے از طرفت گشت شروع ایں ہمہ اقوالِ مزخرف شنوائے مردکِ ناداں۔

یہ ۳۷ رکن کا مصرع ایک سانس میں کون پڑھ سکتا ہے؟ حق یہ ہے کہ تعدادِ ارکان نہ اس قدر کم ہو کہ بے لطف ہو جائے نہ اس قدر زیادہ ہو کہ بے کیف معلوم ہونے لگے۔ وزنِ شعر میں اعتدال شرط ہے کہ خوش گوار رہے۔

تذکرۂ آبِ حیات میں متذکرہ بالا مصرع کو "بحرِ طویل" لکھا ہے۔ یہ بھی اسی قیاس پر ہے کہ ہر مصرع بہت طویل ہے ورنہ بحرِ طویل ایک دوسری بحر ہے جو مقابلتاً دوسری بحروں سے زائد طویل نہیں۔

تبدیلی نظامِ سکونات

سکونات کا نظام تابع ہے 'نظامِ ترتیبات' کے۔ جب وہ بدلتا ہے تو یہ بھی بدل جاتا ہے۔ نظامِ ترتیبات میں دو طرح کی تبدیلی ہوتی ہے (۱) ترتیبی (۲) تحقیقی۔ ذکرِ بحور کا دار و مدار اجزائے ارکان کی ترتیب بدل پر ہے اور اختراعِ فروع کا انحصار حروف حرکات ارکان کی تخفیف پر۔

ترتیبی تبدیلیاں

عروضیوں نے فکِ بحور کا یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ وہ کسی ایک رُکن خط دائرہ
لاکر جزو پر لاکر جزو اول سے ابتدا کر کے ایک بحر نکالتے ہیں تو جزوِ دوم سے
تبدا کر کے دوسری بحر نکالتے ہیں جس کے نتیجے میں جزو مقدم کی جگہ جزو موخر
لے لیتا ہے اور جزو موخر کی جگہ جزو مقدم آجاتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے کا
سکون خود اختیار کرنا ہوتا ہے اور اپنا سکون دوسرے کو سونپ دینا ہوتا ہے۔ یہی
تبدیلیاں ان تمام ارکان میں ہوتی ہیں جنھیں ایک ہیئت سے دوسری ہیئت میں
یا جاتا ہے جن پر تین دائرے گواہ ہیں۔

اشارات حل دوائر

لامت سکونِ صغیر (د) : جزوِ مقدم کے لیے۔
لامت سکونِ مساوی (ہ) : جزوِ موخر کے لیے۔
امت سکونِ کبیر (○) : رکنِ آخر کے حرفِ آخر کے لیے۔
ط اتصال (. . . . . .) : ایک رکن کو دوسرے سے ملانے کے لیے۔
ط انفصال (ر) : رکن کے جزو مابعد کو ماقبل سے علاحدہ کرنے کے لیے۔

متقارب - متدارک

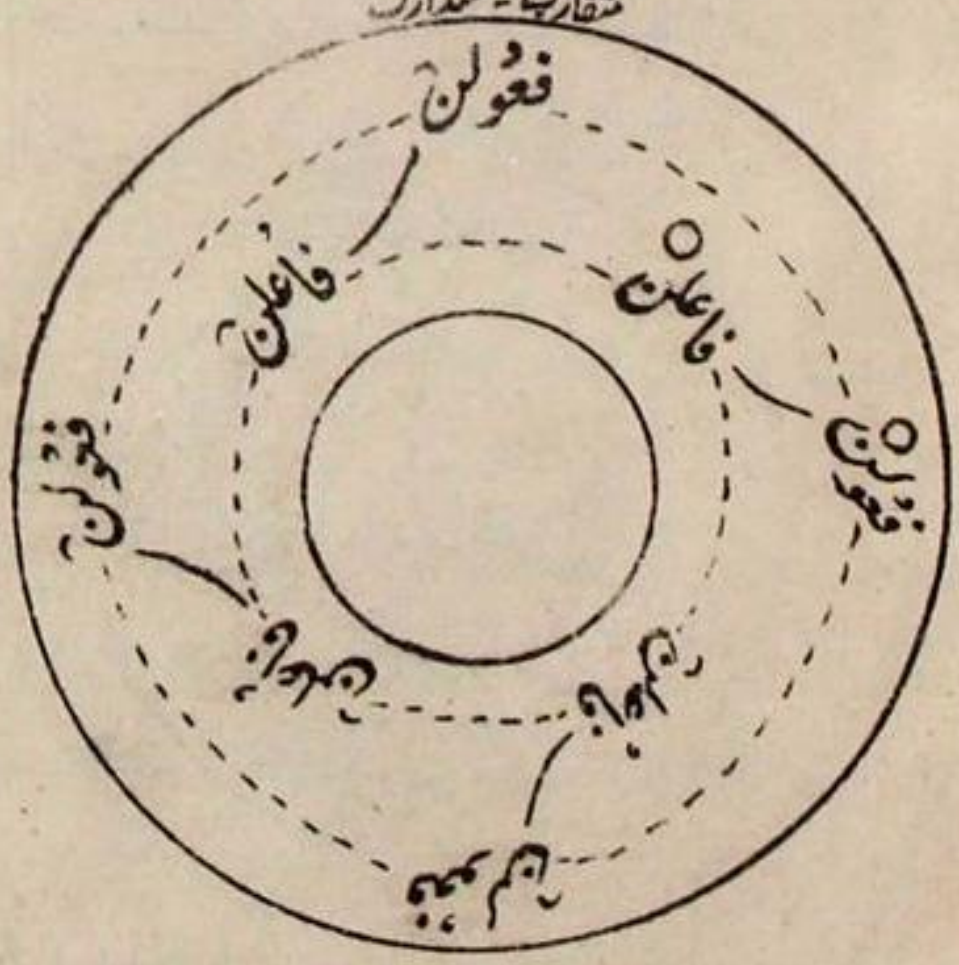

ابتدا:۔ فعولن۔ فعولن۔ فعولن۔ فعولن (بحرِ متقارب)
رد:۔ لن فعو۔ لن فعو۔ لن فعو۔ لن فعو
بدل:۔ فاعلن۔ فاعلن۔ فاعلن۔ فاعلن۔ (بحرِ متدارک)

وافر۔ کامل

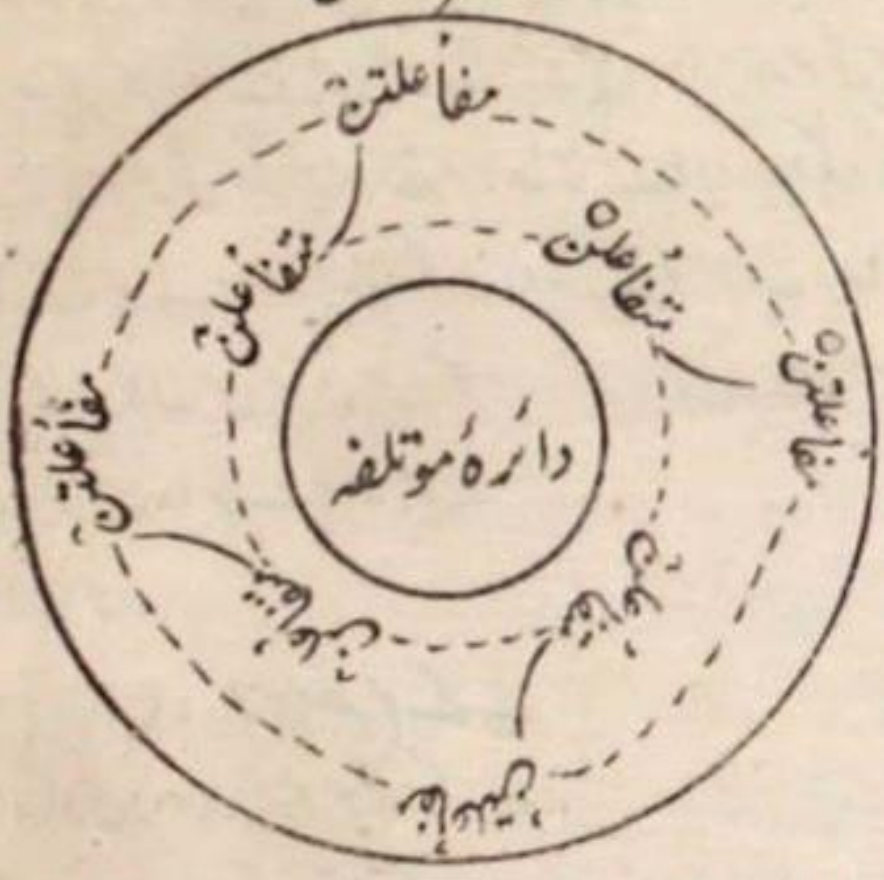

ابتدا:۔ مفاعلتن۔ مفاعلتن۔ مفاعلتن۔ مفاعلتن۔ (بحرِ وافر)
رد:۔ علتن مفا۔ علتن مفا۔ علتن مفا۔ علتن مفا
بدل:۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ متفاعلن۔ (بحرِ کامل)

ہزج۔ رجز۔ رمل

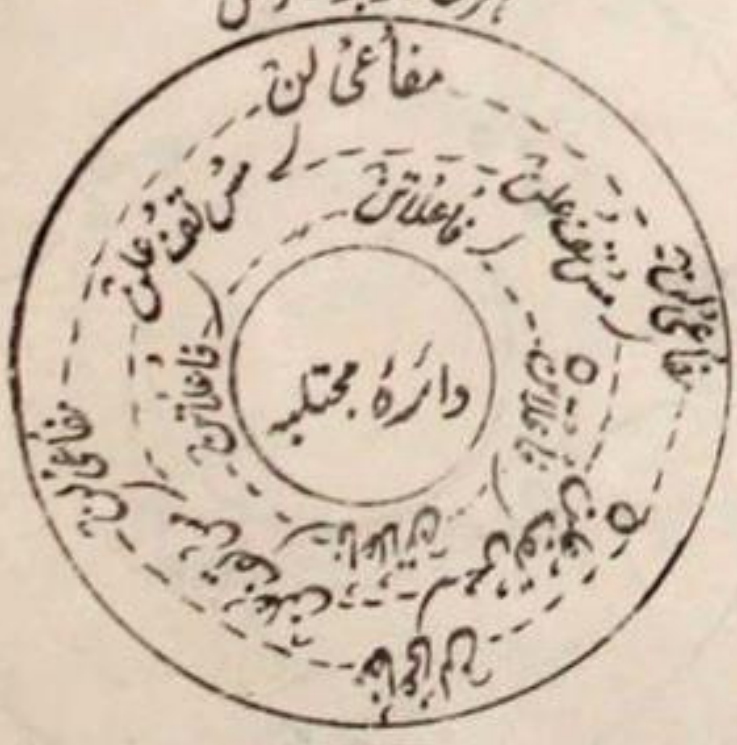

ابتدا:۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ مفاعیلن۔ (بحرِ ہزج)

رد :۔ عیلن مفاعلین مفاعلین مفاعیلن مفا۔
بدل :۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ مستفعلن۔ (بحر رجز)
رد :۔ تفعلن مس۔ تفعلن مس۔ تفعلن مس۔ تفعلن مس۔
بدل :۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ فاعلاتن۔ (بحر رمل)

تخفیفی تبدیلیاں

جس وقت عروضی کسی اصل سے کوئی فرع اختراع کرتے ہیں تو کہیں رُکن سے جزو کم کرتے ہیں، کہیں جزو سے حرف اور کہیں حرف سے حرکت ـــ ان تخفیفات کا اصطلاحی نام 'زحاف' ہے اور ہر زحاف کا ایک ایک نام علاحدہ بھی ہے۔

زحافات بہت ہیں مگر اس محل پر اتنے ہی زیر بحث لائے جائیں گے جو نظام سکونات کی تبدیلیوں کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوں۔

زحافات کے زیر اثر ارکان بحر میں چار طرح کی تبدیلی ہوتی ہے، (۱) ارکان کی ہیئت بدل جانا (۲) سکونات میں کمی ہو جانا (۳) سکون کا بڑھ جانا (۴) سکون کی جگہ نہ بدلنا مگر مزاج بدل جانا۔

تخفیف جزو

جزو کا کم کیا جانا رُکن آخر سے مختص ہے۔ اگر وہ وتد ہے تو اس کے دور کرنے کا نام حذو ہے جیسے "مُس تَف عِلُن" "مُتَفَاعِلُن" سے علُن کا دور کرنا اور اگر سبب ہے تو اس کے دور کرنے کا نام حذف ہے جیسے فَعُولُن، مفاعیلُن سے لُن اور فاعلاتُن سے تُن دور کرنا اور دو سبب خفیف گرانے کو جبّ کہتے ہیں جیسے مفاعیلُن سے عیلُن کا دور کرنا۔ اگر جزو آخر رُکن فاصلہ ہے تو پورا جزو دور نہیں کیا جاتا۔

رُکن سے ایک جزو کم ہو گا تو ایک سکون اور دو جزو کم ہوں گے تو دو سکون کم ہو جائیں گے اور ساکن ماقبل جو پہلے سکونِ صغیر تھا جگہ بدل جانے سے سکونِ کبیر ہو جائے گا، جیسے فعُولن سے لن دور ہو جانے پر فعو کے واؤ کا سکون۔

تخفیف حرف

حرفِ متحرک کسی جگہ سے ساقط ہو اس کا کوئی اثر نظامِ سکونات پر نہیں پڑتا۔ اس لیے اسے موضوع بحث سے خارج سمجھ کر ترک کیا جاتا ہے۔ لیکن حرفِ ساکن کا اسقاط اثر انداز ہوتا ہے۔

حرف ساکن سبب سے ہر جگہ کم کیا جاتا ہے لیکن وتد سے صرف اس وقت جب کہ وہ رکن آخر کا حرف آخر ہو اور فاصلہ سے جب تک وہ فاصلہ ہے ساکن آخر کہیں کم نہیں ہوتا۔

ساکن سبب کے حرف دوم ہو کر گرنے کا نام خبن ہے جیسے فاعِلُن سے فعِلُن۔ حرف چہارم ہو کر گرنے کا نام طے ہے، جیسے مُس تفعِلُن سے مُس تعلن جس کا بدل مُفتعِلُن ہے۔ حرف پنجم ہو کر گرنے کا نام قبض ہے جیسے مفاعِیلُن سے مُتفاعِلُن اور حرفِ ہفتم ہو کر گرنے کا نام کف جیسے فاعلاتن سے فاعلات۔

لیکن رکن آخر کا حرف پنجم ہو خواہ حرف ہفتم جب دور کیا جاتا ہے تو متحرک ماقبل کی حرکت بھی اسی کے ساتھ دور کر دی جاتی ہے کہ یہ محل ختمِ دور کا ہے جہاں توقف لازمی ہے۔

اگر ساکن آخر مع حرکتِ ماقبل سبب سے دور ہو گا تو قصر کہیں گے اور اسی طرح وتد سے دور ہو گا تو قطع کہیں گے۔

زحافات مذکور کا نظامِ ترتیبات پر یہ اثر ہوا ہے کہ حرفِ ساکن کے اسقاط سے سبب کی ہستی معدوم ہو گئی اور جزو مابعد، ایک حرف متحرک کے شامل ہو جانے سے سبب تھا وتد بن گیا اور وتد تھا تو فاصلہ ہو گیا اور رکنِ خماسی رباعی ہو گیا اور ارکان سباعی سداسی بن گئے اور نظامِ سکونات پر یہ اثر ہوا کہ ایک ایک سکون ہر رکن سے کم ہو گیا اور آخر میں جو سکون کم ہوا تھا وہ حرکت ماقبل کے دور ہو جانے سے پھر پیدا ہو گیا۔ جیسا کہ مثالوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔ مگر تخفیفِ سکونات کے بعد جو سکونات باقی رہ جاتے ہیں ان میں بعض کا مزاج خاص حالتوں میں بدل جاتا ہے۔

جن فروع میں مزاحف ہونے کے بعد بھی تمام ارکان تعدادِ حروف و حرکات

میں برابر رہتے ہیں۔ ان میں کسی سکون کا مزاج نہیں بدلتا۔ مثلاً ہزج مثمن مقبوض۔

مفاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعلن۔ مفاعلن میں سکونات صغیر و مساوی و کبیر اپنی اپنی جگہ برقرار ہیں مگر جہاں ایک رکن سالم رہتا ہے اور مزاحف ہو جاتا ہے جیسے بحر رمل مثمن مجنوں مکفوف

فَعِلاتُ۔ فاعلا تن۔ فَعِلات۔ فاعلاتُن

یا اکثر زحافات سے دونوں رکن مزاحف ہونے کے بعد یکساں نہیں رہ جاتے اور انھیں کی تکرار سے وزن پورا کیا جاتا ہے جیسے بحر رجز مثمن مطوی مجنوں۔

مفتعلن۔ مفاعلن۔ مفتعلن۔ مفاعلن۔

تو ایک مصرعہ ایک شعر کے حکم میں آجاتا ہے۔ کیوں کہ دو رکنوں پر نظام ترتیبی تمام ہو جاتا ہے۔ پھر دو رکن مکرر آکر حروف و حرکات کی مطابقت سے تصدیق وزن کر دیتے ہیں اور ہر شعر چار ٹکڑے کر کے پڑھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ عرف عام میں ایسی ہر بحر کو شکستہ بحر کہتے ہیں۔

مصرع کے درمیانی وقفے بجائے سکون مساوی سکون کبیر کی شان پیدا کر لیتے ہیں جہاں ایک حرف ساکن آسانی سے کھپ جاتا ہے۔ مثلاً غالب کے مندرجہ ذیل مطلع میں ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت　　درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار　　کوئی ہمیں ستائے کیوں

ہر مصرع کے پہلے ٹکڑے میں ایک ساکن بڑھا ہوا ہے جس کا وزن ہے مفتعلن مفاعلان۔ مگر دوسرے دونوں ٹکڑوں کا وزن مفتعلن مفاعلن ہے۔ اگرچہ یہاں بھی ایک ساکن زاید موجود ہے مگر وہ محسوب نہ ہوگا کہ نون غنہ نوعیتِ صوت کا حامل تو ہے مگر میعادِ صوت سے محروم ہے۔

اور جب تمام ارکان ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں جیسے بحر مضارع مثمن کی ایک فرع مفعول۔ فاعلات مفاعیل۔ فاعلن میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری رکن پنج حرفی ہے اور درمیانی ارکان شش حرفی ہیں مگر تلفظی حالت میں ان کو کتابت ذیل کے مطابق سمجھنا چاہیئے۔

مفعو۔ لفاعلا۔ تمفاعی۔ لفاعلن۔ اب پہلا رکن چہار حرفی رہ گیا اور باقی ارکان شش حرفی ہو گئے کہ ہر رکن سبب کو وتد اور وتد کو فاصلہ بناتا چلا گیا ہے۔ مگر وزن کی تکمیل کے لیے چہار حرفی رُکن کو بھی شش حرفی ارکان کے برابر کرنا پڑتا ہے کیوں کہ بحر کے تمام ارکان برابر کی ضربیں ہیں جن کی میعادِ صوت کو کم و بیش نہ ہونا چاہیے۔ لہٰذا رکنِ اوّل (مفعو) کے دونوں سکون، جو درحقیقت سکونِ صغیر ہیں، سکونِ کبیر بن کر دو حرفوں کی کمی کو پورا کر دیتے ہیں۔ جس سے چاروں رکنوں کی میعادِ صوت برابر ہو جاتی ہے۔

اوزانِ عروضی میں ترتیبات کی بنیاد تو ایک سکون پر ہے اس لیے اثنائے وزن میں کہیں دو ساکن جمع نہیں ہوتے لیکن اشعار میں تو دو سے زیادہ ساکن بھی درمیانِ شعر میں کسی کسی جگہ آجایا کرتے ہیں کہ زبان میں بھی طرح کے الفاظ موجود ہیں مثلاً:۔

بے تاب دل کے واسطے تسکین چاہیے

تقطیعِ شعر کے وقت تو بے تاب کی (ب) واسطے کا (س) اور تسکین کا (ن) متحرک ہو جائے گا کہ موزوں کلام کو موزوں بہ سے مطابق کر کے جانچا جا سکے مگر مصرع پڑھنے کے وقت حروف مذکور ساکن ہی رہیں گے اور ساکن ماقبل کے ساتھ شامل ہو کر کم حروف والے رکن کی میعادِ صوت کو زیادہ حروف والے رکن کی میعادِ صوت کے برابر کرنے میں شریک ہو جائیں گے اور اگر تین ساکن درمیان میں کسی جگہ آجائیں گے تو ساکنِ آخر تقطیع سے خارج سمجھا جائے گا مگر تلفظ کے وقت اس کی نوعیتِ صوت ساکن ماقبل کے ساتھ جھلک دکھاتی رہے گی۔ مثلاً:۔

اے دوست دشمنی بھی تری دشمنی نہیں

دوست کی (ت) تقطیع سے ساقط مگر میعادِ صوت پوری کرنے کے لیے تلفظ میں شامل ہے۔

یہی حالت ان تمام فروع میں ہوتی ہے جن کے ارکان تعداد حروف و حرکات میں یکساں نہیں رہتے۔

الحاصل ارکان بحر سے جزو اور اجزائے ارکان سے حرف اور حرفِ آخر سے حرکت دور کرنا وہ زحافات ہیں جن کا التزام ضروری ہے کہ بغیر اس کے استقلالِ فرع

ن نہیں۔

تخفیفِ حرکت

تخفیف حرکت کے دو محل ہیں۔ ایک رکن آخر کے متحرک آخر سے جیسا کہ اسقاط
کن آخر کی بحث میں بیان ہو چکا۔ دوسرے توالی حرکات کے وقت بیچ کے حرف
حرک سے۔ نام اس کا تسکینِ اوسط ہے یہ زحاف مختص ہے فاصلہ سے کہ تین متحرک
ا میں ایک جگہ ملتے ہیں۔ عام اس سے کہ فاصلہ رکن اصلی میں ہو جیسے "متفاعلن"
"مفاعلتن" میں یا رکن مزاحف میں جب کہ سبب و وتد متغیر ہو کر فاصلہ کی
رت اختیار کر لیتے ہیں جیسے "فاعلن" سے "فعِلُن" اور "فاعلاتن" سے "فعِلاتن"
جانے پر جس کے بعد ایک فاصلہ سے دو سبب بن جاتے ہیں۔

عروضیوں نے محل اور موقع کے بدل جانے پر اس کے نام بھی بدلے ہیں۔
لاً وہ بحر کامل میں حرکت تائے "متفاعلن" کے دور کرنے کو اضمار کہتے ہیں تو لام
تفاعلتن" کی حرکت دور کرنے کو "عصب" کہتے ہیں مگر ہم جگہ تسکین ہی کہہ کر ذکر
یں گے کہ نتیجہ ہر محل پر ایک ہی نکلتا ہے۔

یہ درمیانی سکون اگرچہ محل پر سکونِ صغیر کے ہوتا ہے مگر مزاج اس کا سکونِ
ادی کا ہے کیوں کہ یہ سکون قائم مقام حرکت ہے۔ جب تک اسے اتنا نہ بڑھاؤ کہ
فِ ساکن کی میعادِ صوت حرفِ متحرک کے برابر ہو جائے اس وقت تک وزنِ بحر
کمی محسوس ہوتی رہتی ہے۔

ارکانِ سالم میں تسکین کے التزام سے یہ خرابی پڑتی ہے کہ بحرِ کامل کے ارکان
متفاعلن" سے "مستفعلن" بن کر بحرِ کامل کو بحرِ رجز بنا دیتے ہیں اور بحرِ وافر
ے ارکان "مفاعلتن" سے "مفاعیلن" بن کر اسے ہزج کے سانچے میں ڈھال
یتے ہیں۔ یہ تحصیل حاصل بے کار کی دردِ سری ہے۔

ارکان مزاحف میں یہ خفیف سا تغیر کوئی مستحکم فرع قائم کرنے کی صلاحیت
یں رکھتا۔ غرض کہ تسکین کے التزام کا فائدہ تو ایک بھی نہیں مگر نقصان دو دو ہیں
ک تو ترک التزام سے جو تنوع پیدا ہو سکتا ہے وہ مٹ جاتا ہے۔ دوسرے

استعمال الفاظ کے وقت دائرہ اختیار تنگ ہو جاتا ہے۔ یہ گنجائش باقی نہیں رہ جا
کہ چاہے ایک کلمہ چہار حرفی استعمال کرے چاہے دو کلمے دو حرفی۔

عروضیوں نے استعمالِ الفاظ کے وقت اسی دائرۂ اختیار کو وسیع کرنے
لیے رکن آخر کے جزو آخر میں ایک حرف ساکن کا بڑھا رہنا بھی جائز رکھا ہے کہ دو حر
کلمے کی جگہ سہ حرفی اور سہ حرفی کی جگہ چہار حرفی لایا جا سکے اور حرف آخر کے سکون کو
کی طوفانی کشش اسے آسانی سے لپیٹ لے۔

یہ ساکن آخر علاحدہ سے نہیں بڑھایا جاتا ہے بلکہ جزو آخر سے حروف کم کر
کے وقت اس کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً رکن "مفاعیلن" کے آخر سے کبھی چار حرو
کم کرتے ہیں، کبھی تین۔

الحاصل بیچ سے حرکت کا کم ہونا اور آخر میں حرف ساکن کا کم و بیش ہوتے ر
غیر التزامی زحافات ہیں جن کے لانے نہ لانے کا اختیار ہے۔

اوزانِ رباعی، جو چوبیس ہونے پر بھی ایک وزن کے حکم میں مانے جاتے ہ
زیادہ تر انھیں غیر التزامی زحافات کو کام میں لانے سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

موجدِ اوزان رباعی کے عرب نہیں بلکہ عجم ہیں، جنھوں نے استخراج اوزان کے
اصول سے ہٹ کر ایک ایسا قاعدہ ایجاد کر دیا جس نے اوزانِ عروضی کی سرحد اوزا
موسیقی سے ملا دی اور شاید اسی مناسبت سے رُباعی کو ترانہ بھی کہتے ہیں۔

اوزانِ عروضی میں ہر فرع کسی اصل بحر سے نکلی ہے۔ کسی فرع سے دوسری فر
نہیں اختراع کی گئی ہے اور کسی ایک مستقل وزن کا خلط بھی دوسرے کے ساتھ جائز
نہیں رکھا گیا ہے۔ عام اس سے کہ وہ وزن اصلی ہے یا فرع ہے کسی اصل کی۔

واضح اوزان رباعی نے بنیاد اوزان رباعی کی فروع ہزج پر رکھی ہے اصل
سے کچھ سروکار نہیں۔ جیسا کہ شجرہائے اخرب و اخرام سے ظاہر ہو رہا ہے اور ایک
خاص قاعدے کی مداخلت سے مختلف فروع کو ایک کر دیا ہے کہ قاعدے کو قاعد
باطل کر سکتا ہے اور مقصد اس دردسری اور ردّ و بدل کا تنوعِ ایقاع ہے۔

خواجہ حسن بن قطّان نے کہ علمائے خراسان سے تھا مفاعیلن اخرب (مفعول
سے ایک شجرے کی ابتدا کی اور مفاعیلن اخرم (مفعولن) سے دوسرے شجرے کی

رکھی۔ پہلے کا جزوِ آخر وتدِ مفروق ہے اور دوسرے کا سبب خفیف۔ اب اس
وتد بعد وتد اور سبب بعد سبب کا قاعدہ جاری کر کے دوسرے مزاحف
ن لانا شروع کیے تو مفعول کے بعد مفاعلین مقبوض (مفاعلن) آیا۔ یا مفاعیلن
ف (مفاعیل) آیا۔ اس کے بعد پھر مفاعیل آیا اور آخر میں مفاعیلن مجبوب
ا) آیا۔ جسے فعل سے بدل دیا۔ جن سے دو شکلیں بن کر ایک سمجھی گئیں:۔
(۱) مفعول، مفاعلن، مفاعیلُ۔ فعل۔ (۲) مفعول، مفاعیلُ، مفاعیلُ،
اور مفعولن کے بعد یا مفاعیلن اشتر (فاعلن) آسکتا تھا یا مفاعیلن
ب (مفعول) کہ سبب بعد سبب کے لیے یہی دونوں رُکن مناسب تھے۔ دو شکلیں
کے بھی بنیں:۔
(۱) مفعولن۔ فاعلن۔ مفاعیل۔ فعل (۲) مفعولن۔ مفعول۔ مفاعیل فعل۔
رکن دوم کا جزو دوم وتد تھا اس لیے بعد کے ارکان ایسے ہی لیے گئے جن کا پہلا
وتد ہو، اس طرح یہ چار فرعیں وتد بعد وتد اور سبب بعد سبب کے اصول سے
حکم میں آگئیں جو علاوہ اوزانِ رباعی کے ایک نہیں سمجھی جا سکتیں، نہ اُن کا خلط ہی
ت ہے۔ اس کے بعد مداخلت تسکین اور اضافہ حرف ساکن آخر کے غیر التزامی زحافات
چار شکلوں کی چوبیس بنا دیں۔ سہولت فہم کے لیے یہاں ہم شجرۂ اخرب و شجرۂ اخرم کا
ایک ایک نقشہ دے دیتے ہیں۔

شجرۂ اخرب

۱۔ مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیل۔ فعل ——— وزن اصلی ۱
۲۔ " " " فعول ——— اضافہ ساکن آخر
۱۔ مفعول۔ مفاعلن۔ مفاعیلن۔ فع ——— مداخلت تسکین بہ فائے فعل
۲۔ " " " فاع ——— اضافہ ساکن آخر
۱۔ مفعول۔ مفاعیل۔ مفاعیل۔ فعل ——— وزن اصلی ۲
۲۔ " " " فعول ——— اضافہ ساکن آخر
۱۔ مفعول۔ مفاعیل۔ مفاعیلن۔ فع ——— مداخلت تسکین بہ فائے فعل

۸۔ مفعول۔ مفاعیل۔ مفاعیلن۔ فاع ـــــ اضافۂ ساکن آخر
۹۔ مفعول۔ مفاعیلن۔ مفعول۔ فعل ـــــ مداخلت تسکین بہ میم مفاعیل
۱۰۔ " " " فعول ـــــ اضافۂ ساکن آخر
۱۱۔ مفعول۔ مفاعیلن۔ مفعولن۔ فع ـــــ مداخلت تسکین بہ میم مفاعیل و فاے فعل
۱۲۔ " " " فاع ـــــ اضافۂ ساکن آخر

شجرۂ اخرم

۱۔ مفعولن۔ فاعلن۔ مفاعیل۔ فعل ـــــ وزن اصلی ۳
۲۔ " " " فعول ـــــ اضافہ ساکن آخر
۳۔ مفعولن۔ فاعلن۔ مفاعیلن۔ فع ـــــ مداخلت تسکین بہ فاے فعل
۴۔ " " " فاع ـــــ اضافہ ساکن آخر
۵۔ مفعولن۔ مفعول۔ مفاعیلن۔ فعل ـــــ وزن اصلی ۴
۶۔ " " " فعول ـــــ اضافہ ساکن آخر
۷۔ مفعولن۔ مفعول۔ مفاعیلن۔ فع ـــــ مداخلت تسکین بہ فاے فعل
۸۔ " " " فاع ـــــ اضافۂ ساکن آخر
۹۔ مفعولن۔ مفعولن۔ مفعول۔ فعل ـــــ مداخلت تسکین بہ میم مفاعیل
۱۰۔ " " " فعول ـــــ اضافۂ ساکن آخر
۱۱۔ مفعولن۔ مفعولن۔ مفعولن۔ فع ـــــ مداخلت تسکین بہ میم مفاعیل و فاے فعل
۱۲۔ " " " فاع ـــــ اضافۂ ساکن آخر

یہ چوبیس شکلیں ایک وزن کے حکم میں مانی جاتی ہیں۔ یعنی رباعی کے چاروں مصرعے چاہے ایک شکل کے مطابق ہوں چاہے علاحدہ علاحدہ مگر ہوں انھیں مذکورہ شکلوں میں سے کسی ایک کے مطابق لیکن بعض عروضی ایک شجرے کی شکلوں کا خلط دوسرے شجرے کی اشکال کے ساتھ جائز نہیں سمجھتے مگر میری راے میں یہ خلط جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ کیونکہ اختراع ارکان رباعی کی غرض و غایت تنوع ایقاع ہے اور وہ چوبیس وزنوں کے خلط ہی سے بہ درجۂ اتم حاصل ہوتی ہے اور جو لوگ چوبیس

سے زائد شکلیں بتاتے ہیں وہ قواعدِ مذکور کی پابندی میں ناممکن معلوم ہوتی ہیں۔
رُباعیاتِ ذیل کو دونوں نقشوں سے مطابق کر کے دیکھنے پر معلوم ہو جائے گا
کہ کس مصرع کا کیا وزن ہے۔

رُباعیات

دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہے
پھر کر نہیں آتا جو نفس جاتا ہے
جب سال گرہ ہوئی تو عُقدہ یہ کھُلا
یاں اور گرہ سے اک برس جاتا ہے

انیس

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں
یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

انیس

یارب جبروتی تجھے زیبندہ ہے
ہر تن ترے سجدے میں سرافگندہ ہے
پڑھتا ہے یہی کلمۂ توحید دبیر
جو تیرے سوا ہے وہ ترا بندہ ہے

دبیر

ناداں کہوں کہ دل کو خردمند کہوں
یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر
کس مُنہ سے میں بندوں کو خداوند کہوں

دبیر

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

غالب

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

غالب

ماضی کو حال کوئی کہنے کا نہیں
سیدھا دریا الٹ کے بہنے کا نہیں
ہر ایک زمانے کے جُدا ہیں نیرنگ
جو تھا وہ نہیں جو ہے وہ رہنے کا نہیں

آرزو

دونوں یکساں ہیں جب زمانہ چھوٹا
جبّہ بھی نہ چھوٹا کہ خزانہ چھوٹا
بربادیِ خاشاک سے کیا کام اُسے
جس مُرغ چمن سے آشیانہ چھوٹا

آرزو

کب صلح کا ہے پیام لینے والا
زور بازو سے کام لینے والا
کمزور ہے آرزو اگر حاملِ جور
شہ زور ہے انتقام لینے والا

آرزو

سکون کا مزاج بدلنا۔ اسے کھینچ کر مقابلتاً میعادِ صوت پوری کرنا یا حرف ساکن کے اضافے سے سکون کبیر کو واضح کرنا درحقیقت یہ عمل موسیقی کے ہیں جنھیں عروضیوں نے برتا تو ہے مگر زیر بحث کبھی نہیں لائے ہیں اور اوزانِ رباعی کی تو بنیاد ہی موسیقیت پر رکھی گئی ہے مگر چوں کہ یہ فرع عروض ہی کی سمجھی جاتی ہے لہذا مزاجِ سکونات کی تبدیلی یہاں بھی زیر بحث نہیں لائی گئی ہے۔ برخلاف اس کے ماہرین موسیقی آواز کی کشش کو ایک۔ دو۔ تین۔ چار کر کے گن لیتے ہیں کہ ایک سکون کی حرکتوں کے برابر ہے اور اوزانِ موسیقی سے مراد وہ اوزان نہیں جو کسی طبل و دف وغیرہ پر ضرب سے ادا کیے جاتے ہیں بلکہ یہاں زیر بحث وہ اوزانِ موسیقی ہیں جن کی تابعیت میں الفاظ لائے جاتے ہیں۔

فرقِ اوزان عروضی و اوزان موسیقی

اوزان عروضی تو کلیتہً اوزانِ موسیقی میں داخل ہیں۔ مگر اوزانِ موسیقی خاص حالتوں میں داخلِ اوزان عروضی نہیں سمجھے جا سکتے۔

اوزان عروضی میں حروف کی تعداد اور حرکات و سکونات کی ترتیب سے جو خوش گوار ہیئت قائم کر دی جاتی ہے اس کا توازن ہر جگہ قائم رکھا جاتا ہے، ایک ہیئت میں دوسری ہیئت کا دخل نہیں ہوتا۔

برخلاف اس کے موسیقی میں نہ تعدادِ حروف کی پابندی ہے نہ ترتیبات کی مطابقت ضروری ہے۔

وہ ایک حصہ چھوٹا دوسرا بڑا بھی رکھ سکتے ہیں اور مختلف ترتیبوں کو مخلوط بھی کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اوزان عروضی محدود اور اوزانِ موسیقی لامحدود ہیں۔

حالاتِ جلال

نام و خاندان، ولادت و وفات، وطن و تعلیم

میر ضامن علی نام اور جلال تخلص تھا۔ حکیم میر اصغر علی صاحب کے بڑے بیٹے اور بہ اعتبارِ نسب سید رضوی تھے۔ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور اسّی برس کے ہو کر ۱۳۲۴ھ میں انتقال کیا۔ کربلائے تال کٹورہ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔ سنہ وفات ذیل کے مصرع سے نکلتا ہے:۔

میر ضامن علی جلال آہ آہ

یہ تاریخی مصرع بھی شعرا میں مصرع طرح بن گیا۔ کئی شاعروں نے بھی ایک مصرع نکالا اور قطعہ کر کے کمال مرحوم کے آگے پیش کیا۔ ایک تاریخ میں نے بھی کہی تھی جو درج ذیل ہے:۔

چو استادم کہ بد فردوسی ہند
پے تعلیم روح انوری رفت
نوشتم آرزو تاریخ رحلت
بہار گل ز باغ شاعری رفت

حضرت جلال کے بزرگ لکھنؤ کے محلہ ڈالی گنج پار میں رہتے تھے، یہ بھی وہیں پیدا ہوئے لیکن رام پور سے آنے کے بعد انھوں نے منصور نگر میں قیام کیا اور وہیں سے کوچ کر کے دار البقا کو گئے۔

جلال کی باقاعدہ تعلیم عربی میں میبذی تک تھی مگر مطالعہ بہت وسیع تھا۔ رام پور کے

کتب خانے کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جو پڑھ نہ ڈالی ہو، یہاں تک کتابیں دیکھیں کہ آخر آنکھوں میں ناسور پڑ گئے۔

جناب جلال کا آبائی پیشہ طبابت تھا۔ انھوں نے بھی طب پڑھی تھی۔ کچھ دنوں محلہ سرائے معالی خاں میں آفتاب الدولہ بہادر قلق کے مکان میں مطب بھی کیا تھا۔ مگر جب شاعری ذریعۂ معاش بن گئی تو طبابت ترک کر کے پوری توجہ شاعری کی طرف مبذول کر دی۔ وہ طبیب بھی اس پلے کے تھے کہ باوجود ترک فن کے بعض مریض آکر پریشان کرتے تھے اور بغیر نسخہ لکھوائے کسی طرح نہ ٹلتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت جلال اپنے جاننے والوں میں حکیم صاحب کے نام سے ذکر کیے جاتے تھے۔

ابتدائے شاعری

حکیم صاحب امیر علی خاں ہلال کے شاگرد ہوئے اور انھیں کے تخلص کا ہم وزن و ہم قافیہ تخلص جلال اختیار کیا۔ ہلال چند ہی روز میں ہونہار شاگرد کے کلام کی اصلاح سے عاجز ہو گئے۔ آخر ساتھ لے کر اپنے استاد میر علی اوسط رشک کے پاس پہنچے اور شاگرد کو استاد کے استاد کے سپرد کر آئے۔

رشک علم و تحقیق میں دوسرے ناسخ سمجھے جاتے تھے۔ ان کی شاگردی نے جلال کی عنانِ خیال، مشقِ شعر سے تحصیلِ فن اور تحقیق مسائل کی طرف پھیر دی۔ جب رشک زیارات عتبات عالیات کو گئے[1] اور وہیں کے ہو رہے تو جلال نواب فتح الدولہ برق سے اصلاح لینے لگے۔

برق بھی شیخ ناسخ کے ممتاز تلامذہ میں سے تھے۔ حکیم صاحب کو ان کی شاگردی سے بھی بہت کچھ فائدہ پہونچا کہ زمانے نے پھر پلٹا کھایا اور نواب فتح الدولہ برق بھی معزول شاہ اودھ کے ہم راہ رکاب مٹیا برج چلے گئے اور کچھ دن بعد وہیں انتقال کر گئے مگر اب

---

[1] میر علی اوسط رشک کی روانگی سے متعلق حسب ذیل قطعہ تاریخ حضرت جلال نے کہا ؎

قدسیو، شاہ شہیداں کے مزارِ پاک کا — قصد فرماتے ہیں دیکھو قبلہ و کعبہ مرے
پوچھ کر تاریخ ہاتف سے پکار اٹھا جلال — کربلا جاتے ہیں دیکھو قبلہ و کعبہ مرے

۱۲۶۷ھ

حکیم صاحب خود استاد ہو چکے تھے۔ دو محققوں کی تحقیقات کا خزانہ اُن کے قبضۂ اقتدار میں آچکا تھا اور قوت اجتہادی پیدا ہو چکی تھی۔

بزرگ داشت

ایک مرتبہ کسی مشاعرے میں جلال بھی گئے تھے اور میاں ہلال بھی تھے، مگر جب غزل پڑھنے کا وقت آیا تو ہلال نے نہایت عاجزی کے ساتھ حکیم صاحب سے کہا کہ "میں آپ کے سامنے کیا پڑھوں" مطلب یہ تھا کہ میری جرأت نہیں ہوتی کہ آپ کے سامنے منہ کھولوں اس وقت حکیم صاحب نے کہا "آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں، میں وہی ہوں جس نے آپ کے سامنے بارہا بغرض اصلاح اپنا کلام پیش کیا ہے"۔ اس واقعے سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جلال بہت تھوڑے زمانے میں اپنے استاد سے اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ وہ ان کے سامنے کچھ پڑھتے ہوئے جھجکتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس برتاؤ سے جو انھوں نے اپنے استاد سے برتا جلال کی شریفانہ سیرت کا بھی پتا ملتا ہے۔

ریاست رام پور سے وابستگی

۵۷ء کے غدر کے بعد جو تباہی لکھنؤ پر آئی اس کی داستان بہت عبرت انگیز ہے۔ سیکڑوں آدمی، معزول بادشاہ کے ساتھ چلے گئے۔ ہزاروں خانماں برباد ہو کر غریب الوطن ہو گئے۔ بہتیرے باوضع گھروں میں کنڈیاں بند کر کر کے مر گئے اور اپنی بدحالی کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔ بعض اہل کمال کو دربار رام پور نے اپنے ظل عاطفت میں لے لیا۔ حکیم صاحب کے والد میر اصغر علی صاحب بھی اُنھیں وابستگان دولت میں سے تھے۔ وہ طبیب بھی تھے اور داستان گو بھی، مگر داستان گوئی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ منشی احمد حسین قمر مصنف "طلسم ہوشربا" کو انھیں سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ میر اصغر علی صاحب اسی سلسلے سے نواب محمد یوسف علی خاں بہادر والی رام پور کے دربار میں پہنچے تھے اور ملازم ہو گئے تھے۔

ایک روز داستان کہنے میں کسی خاص موقع پر جو اشعار[1] میر صاحب نے پڑھے وہ اب صاحب کو بہت پسند آئے۔ پوچھا یہ اشعار کس کے ہیں؟ انھوں نے کہا میرے بڑے کے جلال کے ہیں۔ نواب صاحب نے اسی وقت طلب کر لیا۔ حکیم صاحب وہاں پہنچتے ہی چاس روپئے ماہوار پہ ملازم ہو گئے۔

نواب یوسف علی خاں کا زمانہ

اب جلال کو ایک قدرداں بھی ملا اور اطمینان کی زندگی بھی نصیب ہوئی، پھر جو ل کا شوق وہی معاش کا ذریعہ، ترقی کے زینے طے ہونے لگے اور معراج کمال کی آخری نزل تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا اور انجام میں کامیاب ہوئے۔

• ایک روز نواب صاحب نے فرمائش کی کہ کوئی ایسا قصیدہ کہیے جس میں کوئی حرف یسا بھی نہ گرنے پائے جس کا گرنا شعرا نے جائز سمجھا ہے۔ حکیم صاحب نے یہ قصیدہ نظم کر کے سنایا ؎

ہے شگفتہ ہر چمن، وہ رنگ لائی ہے بہار
جوش گل بے انتہا، مرغان گلشن بے شمار
جو شجر ہے باغ کا، وہ کر رہا ہے شکر حق
خاک پر ہر شاخ، سجدے کر رہی ہے بار بار

---

[1] اشعار حسب ذیل ہیں:-

وہ گوندھی یار کی مشاطہ نے پری چوٹی — کہ صدقے کرتی ہے جس پر ہر اک پری چوٹی
نہ بھٹکے پر دل سودا زدہ کبھی اتنا — کرے جو کوچۂ کاکل کی رہبری چوٹی
جو پرورش دل عشاق کی ہے مد نظر — تو ہو دراز پہ سایہ گستری چوٹی
لگائے میرے دل مبتلا کو اک کوڑا — ضرور دے اسے تعزیر خود سری چوٹی
جو بال کھلتے ہیں اُن کے مہکتی ہیں گلیاں — کہ مشک نافہ ہے جوڑا تو عنبری چوٹی
مگر کوئی چمن آرا ہے تیری مشاطہ — بنا دے سنبل گلزار دل بری چوٹی
جلال دیکھے کبھی شانۂ دل صد چاک — نکل کے ایک کی چوٹی ہے دوسری چوٹی

قہقہہ زن کبک ہے، طاؤس گلشن مست ناز
رقص کن اک سو صبا، نغمہ سرا اک سو ہزار
زلف عنبر فام کے مانند سنبل مشک بیز
سرخی رخسار گل مانند روے گلعذار
ہو گئی ہے اس قدر بادہ ہوا گلزار کی
سرو جس کے بر دسے ہر وقت رہتا ہے چنار
کیا قدم ان کو مبارک فصل گلشن کا ہوا
بار اب کی بار لائے سرو ہائے جوئے بار
ہو چکی ہے جمع گو سب انجمن گلزار کی
چشم نرگس پر[1] کسی کا کر رہی ہے انتظار
سب طرح کے گل شگفتہ فصل گلشن نے کیے
اور ہی گل کے لیے بلبل مگر ہے بے قرار

مطلع دیگر

کون، وہ گل زندگانی چمن کی جو بہار
شکل سبزہ فیض سے جس کے ہرا ہے روزگار
ابر لطف و بحر جود و مکرمت، دریاے فیض
پاک دل، روشن گہر، والانسب، عالی تبار
عرش عز و جاہ، شاہنشاہ، عالم کی پناہ
جم حشم، یوسف علی خان امیر ذی وقار
بے تکلف لوگ بنواتے جواہر کے محل
واقعی ہوتے اگر زر بخش ایسے تین چار

---

[1] یہ کلام ابتدائی ہے۔ حضرت جلال نے بعد میں لفظ "پر" کے معنی میں کبھی استعمال نہیں کیا۔

بحر کا دامن لبالب، سیپ کا مملو دہن
بن گیا نیسان رحمت دستِ مروارید بار
کر دیا قطراتِ شبنم کو، گہر دے کر غنی
زر دیا اتنا ہوئے گُل ہائے گلشن مال دار

قطعہ

اس طرح کا شخص، عالی حوصلہ، ہمت بلند
چشم مہر و ماہ سے، گذرا نہ ہوگا زینہار
ماہ کو ہر رات کرتا ہے عنایت تاجِ سیم
بخشتا ہے مہر کو ہر روز شملہ زرنگار
اس دعا پر ختم کر اب تو قصیدے کو جلالؔ
دے شفا کامل مرے نواب کو پروردگار

نواب صاحب نے بہت تعریف کی اور فرمایا کہ میں اس قصیدے کو جواہر میں
ں گا۔ مگر جلالؔ کے نصیب نے جہاں ترقی کمال کے واسطے میدان وسیع دے دیا
وہاں مالی منفعت کے لیے اِک تنگ دائرہ کھینچ دیا تھا۔ دفعتاً نواب صاحب کی
لت نے طول کھینچا، حکیم صاحب کو قصیدے کا صلہ نہ ملا اور نواب صاحب انتقال
گئے۔

حضرت جلالؔ نے نواب صاحب موصوف کے انتقال پر یہ قطعۂ تاریخ کہا ؎

آں مغفرت مآب ز ہستی نمود کوچ
روئے بہ کاروانِ عدم دادہ یوسفے
گفتہ جلالؔ مصرع تاریخ رحلتش
در چاہ قبر حیف بیفتادہ یوسفے
۱۲۸۱ھ

ب کلب علی خاں کا عہد

نواب یوسف علی خاں صاحب کے بعد اُن کے فرزند ارجمند نواب کلب علی خاں

بہادر تخت نشین ہوئے۔ جلال اپنی جگہ برقرار رہے اور مسند نشینی کے متعلق ایک قصیدہ اور متعدد تاریخیں کہیں۔ طول بے محل کے خیال سے یہاں صرف ایک قطعہ لکھا جاتا ہے ؎

کشت چوں کلب علی خاں بہادر بہ جہاں
صاحب طالع اسکندر و ہم رتبۂ جم
مصرعِ سالِ جلوشش چہ رقم ساخت جلال
جلوہ فرمودہ سر مسندِ اقبال و حشم

سنہ ۱۲۸۱ھ

اس عہد میں دربار رام پور کملائے فن سے بھر گیا جو موجود تھے وہ تو تھے ہی، جو نہیں تھے وہ بھی پہنچ گئے۔ منشی مظفر علی خاں اسیر تو نواب مرحوم کے استاد اور اُسی وقت سے وظیفہ خوار تھے۔ منشی امیر احمد صاحب امیر عہدۂ قضا پر مامور ہوئے۔ نواب مرزا خاں صاحب داغ داروغۂ اصطبل مقرر ہوئے۔ علاوہ ان کے مفتی سعد اللہ صاحب شارح معیار الاشعار، آفتاب الدولہ قلق، امداد علی بحر اور نواب احمد حسن خاں عروج ایسے باکمالوں سے دربار معدنِ علم و ادب ہو گیا۔ مرزا غالب بھی دربار کے وظیفہ خوار تھے اور کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔

مرزا نوشہ سے جلال کی ملاقات

ایک مرتبہ حکیم صاحب مرزا سے ملنے گئے۔ مرزا اُس وقت شراب نوشی میں مصروف تھے ایک جام حکیم صاحب کے سامنے بھی پیش کیا۔ اُنھوں نے کہا "میں نہیں پیتا ہوں"۔ مرزا نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا "آج تو ابر ہے" جلال نے پھر انکار کیا۔ غالب نے کہا "ابر بھی ہے اور سردی بھی ہے"۔ آخر جلال نے جھلا کے کہا "میں حرام جانتا ہوں"۔ اُس وقت غالب مسکرائے اور بولے کہ "پھر یہ شعر آپ نے کیونکر کہا ؎

رات مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

دربار میں قافیے کی بحث

دربار میں آئے دن مشاعرے اور مناظرے ہوا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کسی بات

ں دخل کم دیتے تھے اور اگر بولنے پر مجبور ہوتے تھے تو اکثر انھیں کی بات بالا رہتی تھی
یسی ہنگامہ آرائیاں بہت ہوئیں۔ سب کے لکھنے میں طوالت ہے، بعض خاص خاص واقعات
رج کیے جاتے ہیں۔

نواب کلب علی خاں صرف شاعروں کے قدرداں ہی نہ تھے بلکہ خود بھی پختہ کار شاعر
تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ نواب صاحب نے دربار میں اپنی ایک نو تصنیف غزل
پڑھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

دیکھ کر رنگ اس کی قامت کے
ہوش اُڑ جائیں گے قیامت کے

مطلع پر واہ واہ، سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں مگر حکیم صاحب اپنی جگہ خاموش بیٹھے
رہے۔ نواب صاحب کی نظریں تو سبھی پر رہتی تھی مگر حکیم صاحب کی طرف خاص طور پر
توجہ رکھتے تھے۔ جب غزل پڑھ چکے تو پوچھا کہ کیوں میاں جلال تم نے اور اشعار کی تو تعریف
کی مگر مطلع پر کچھ نہ بولے۔ انھوں نے عرض کی "تمام دربار تعریفیں کر رہا ہے ایک میری
تعریف کیا چیز ہے"۔ نواب صاحب نے فرمایا "تمھیں بھی تو اچھا برا کچھ کہنا چاہیے تھا"۔
عرض کیا "سبحان اللہ، کلام الملوک ملوک الکلام"۔ نواب صاحب اُن کی ادائیں خوب
پہچانتے تھے، فرمانے لگے "صاف صاف کہو، یہ کلام الملوک اور ملوک الکلام سننا میں
نہیں چاہتا"۔ اس وقت حکیم صاحب ضبط نہ کر سکے اور صاف صاف کہہ دیا کہ "جس مطلع
کے قافیے ہی غلط ہیں، میں اُس کی تعریف کیا کروں"۔ اس پر اہل دربار انگشت بدنداں
ہو گئے اور نواب صاحب نے تیور بدل کر پوچھا "کیا غلطی ہے؟" حکیم صاحب نے فرمایا "حضور
نے مطلع میں ردی کے ساتھ تاسیس و دخیل کا التزام کیا ہے اور اشعار میں اس کی پابندی
نہیں کی، یہ درست نہیں ہے"۔ نواب صاحب نے پوچھا "کیا کسی مستند شاعر نے ایسا نہیں
کیا ہے؟" حکیم صاحب نے فرمایا "ہرگز نہیں، ہر مستند شاعر مطلع کا منشا جانتا ہے اور
سمجھتا ہے کہ پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیے کا اختیار کرنا اس امر کا اظہار ہے کہ کن
کن حروف کی پابندی اختیار کی گئی ہے"۔ نواب صاحب دوسرے شعرا کی طرف متوجہ
ہوئے اور پوچھا "کیا یہ اعتراض درست ہے؟" سوا بحر کے سب نے کہہ دیا کہ "حضور
یہ یوں ہی کہا کرتے ہیں، جس طرح حضور نے فرمایا ہے بالکل درست ہے"۔ نواب

صاحب نے فرمایا "یہ اعتراض کا جواب نہیں ہے، مثال پیش کرو" تمام اساتذہ کے دواوین اُلٹ پلٹ کر ڈالے گئے مگر مثال نہ نکلنا تھی نہ نکلی۔

صاحبزادہ چھٹن صاحب کا مشاعرہ اور داغ و جلال کے مصرعے

نواب صاحب کے داماد صاحبزادہ چھٹن صاحب کے یہاں ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ محمد شاہ خاں جو باڈی گارڈ کے ایک معزز عہدہ دار اور حکیم صاحب کے جاں نثار شاگرد تھے آکر کہنے لگے کہ "شاگردانِ داغ نے آپس میں طے کیا ہے کہ آپ کی غزل پر تعریف نہ کریں"۔ حکیم صاحب نے فرمایا "یہ حالت ہے تو مشاعرے میں جانا بے سود ہے"۔ محمد شاہ خاں نے کہا "نہیں مشاعرے میں تو ضرور تشریف لے چلیے۔ جیسا کچھ ہوگا دیکھا جائے گا"۔ حکیم صاحب اُن کے تیور بد دیکھ کر فرمایا کہ "نہیں میں مشاعرے میں نہ جاؤں گا"۔ محمد شاہ خاں نے کہا "کب تک نہ جائیے گا؟" حکیم صاحب کچھ سوچے اور فرمایا "میں اس شرط سے چلتا ہوں کہ تم لوگ داغ کی غزل پر خاموش نہ رہنا، رہی میری غزل تو اگر اُس میں کچھ خوبی ہوگی تو دشمن بھی داد دے گا"۔

غرض کہ مشاعرے کا دن آیا اور حکیم صاحب مشاعرے میں گئے۔ نشست کی حالت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شعرا کے بیٹھنے کے لئے کوئی ترتیب مقرر نہ تھی، جو جہاں بیٹھ گیا وہاں بیٹھ گیا۔ اس مشاعرے میں جہاں داغ بیٹھے تھے وہاں ان کے قریب کوئی برابر کا شاعر نہ تھا۔ کئی آدمیوں کے بعد حکیم صاحب بیٹھے تھے اور اسی طرح حکیم صاحب کے بعد بھی دو ایک آدمی اور تھے اور ان کے بعد منشی امیر احمد صاحب تشریف رکھتے تھے جس وقت داغ پڑھے خوب رنگ ہوا مگر جب حکیم صاحب کی باری آئی تو دو تین شعر تک وہی آثار ظاہر تھے جن کی خبر پہلے مل چکی تھی۔ اثنائے خوانندگی میں حکیم صاحب نے داغ سے فرمایا کہ "میرا ایک مصرع آپ سے لڑ گیا ہے، اس لیے میں اس شعر کو ترک کرتا ہوں"۔ داغ نے اصرار کیا کہ "نہیں ضرور پڑھیے"۔ اور لوگوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی کہ دیکھیں انھوں نے کیسا مصرع لگایا ہے۔ داغ کا شعر تھا ؎

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال بُرا، ایک کا حال اچھا ہے

حکیم صاحب نے پڑھا ؎

دل مرا، آنکھ تری، دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال برا، ایک کا حال اچھا ہے

شعر پڑھنا تھا کہ مشاعرے میں ہنگامہ مچ گیا۔ تعریف نہ کرنے کا بندھا ہوا عہد ٹوٹ گیا اور سب تعریفیں کرنے لگے۔ صاحبزادہ چھٹن صاحب نے یہ کہہ کر داد دی کہ "داغ کے مصرع میں ابہام رہ گیا اور آپ نے صاف کر دیا کہ کس کا حال بُرا اور کس کا حال اچھا ہے۔

کلام کا اثر

حکیم صاحب کے کلام سے لوگ اسی طرح متاثر ہوتے تھے۔ ایک واقعہ اور ملاحظہ ہو۔ دوسرا دیوان "کرشمہ گاہ سخن" مرتب ہو چکا تھا اور صاف کرنے کے لیے کاتب کے سپرد کیا گیا تھا۔ کاتب صاحب صوفی منش تھے جیسے ہی اس شعر پر پہنچے ؎

وہ آنکھ ہی نہیں اُن کو ملی کہ حضرت شیخ
بتوں میں قوتِ پروردگار دیکھیں گے

ایک نعرہ مارا اور سجدے میں جا کر بے ہوش ہو گئے۔ حکیم صاحب اندر تھے۔ اس آواز پر گھبرا کے باہر آئے۔ کاتب صاحب کا یہ حال دیکھ کر اور گھبرائے۔ ہوشیار کر کے حال پوچھا تو انھوں نے کہا کہ آپ کے اس شعر نے مجھے بے اختیار کر دیا۔

لفظ "زرا" کا املا

لفظ "زرا" کا املا پہلے "ذال" سے تھا۔ حکیم صاحب نے "زے" سے لکھنا شروع کیا۔ عرصے کے بعد لوگوں نے اسی کو صحیح مانا۔ مجھ سے خود ریاض احمد صاحب ریاض خیرآبادی نے ایک دن بیان کیا کہ "زرا" کو "زے" سے لکھنے کی ابتدا تمہارے استاد نے کی اور پندرہ برس بعد منشی امیر احمد صاحب نے بھی اس لفظ کو "زے" سے لکھنے کی اپنے شاگردوں کو ہدایت کی۔"

جلال کی خودداری اور نواب کی قدردانی

جلال ایک خود دار بزرگ تھے۔ اپنے فن کی عزت تاج کی عزت سے زیادہ جانتے تھے۔ نواب کلب علی لاکھ منصف مزاج تھے پھر بھی والی ملک تھے۔ راج ہٹ مشہور ہے۔ بارہا جلال سے بگڑی، اکثر تو جلال خود ہی بگڑ کر لکھنؤ چلے آئے اور پھر بلائے گئے۔ مگر ایک مرتبہ خود نواب صاحب نے بگڑ کر کہا کہ "نکل جاؤ میرے ملک سے"۔ بھلا اب جلال کہاں ٹھہرنے والے تھے۔ بستر باندھا اور چل کھڑے ہوئے۔ مگر نواب صاحب بعد کو پشیمان ہوئے اور حکم صادر کر دیا کہ جلال جانے نہ پائیں۔ جس وقت حکیم صاحب ناکے پر پہنچے تو روکے گئے اور کہا گیا کہ آپ کے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ حکیم صاحب کو پلٹنا پڑا۔ دربار میں پہنچ کر شکایت کی کہ "آپ نہ مجھے رہنے دیتے ہیں نہ جانے دیتے ہیں"۔ نواب صاحب نے کہا "ہماری زندگی بھر کہاں جاؤ گے۔ یہ شعر و شاعری کے جھگڑے تو رہا ہی کرتے ہیں اور انھیں جھگڑوں میں لطف ہے"۔

عروض دانی

ایک مرتبہ حکیم صاحب لکھنؤ آئے ہوئے تھے کہ نواب صاحب کا خط آیا جس میں ایک غزل بھی تھی۔ نواب صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ میں نے اس غزل میں کوئی الف ہندی کا بھی نہیں گرایا ہے۔ جلال نے ایک غزل نو شعر کی کہی اور اس میں یہ التزام کیا کہ کوئی حرف حروف علت میں سے نہ گرنے پائے اور ایک شعر میں تسکین اوسط اس طریقے سے لائے کہ بغیر تسکین کے پڑھو تو "ی" گرتی تھی اور تسکین کے ساتھ پڑھو تو نہیں گرتی تھی۔ غزل تلاش کرنے پر بھی نہ ملی مگر وہ صورت ذہن میں ہے جسے میں ایک شعر میں نظم کر کے بغرض وضاحت پیش کیے دیتا ہوں ؎

اللہ دے اضطراب خاطر — بے خوف ہوں اور لرز رہا ہوں
مفعولن فاعلن فعولن — مفعول مفاعلن فعولن

حکیم صاحب نے غزل دی اور لکھ دیا کہ میں نے اس میں الف، واؤ، ی، کوئی حرف نہیں گرایا ہے۔ خط دربار میں کھلا اور پڑھا گیا۔ اسی آخری شعر پر لوگ بے ساختہ

کہہ اٹھے کہ "ی" گر گئی۔ نواب صاحب نے کہا "پھر غور کر لیا جائے" بعد غور و خوض کے یہی طے پایا کہ "ی" گرتی ہے۔ میاں بحر عروض دانی میں مشہور تھے اور یہی خصوصیت انھیں دربار رام پور میں لے گئی تھی ورنہ استعداد علمی معمولی تھی۔ نواب صاحب بحر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "تم کیا کہتے ہو؟" بحر نے کہا "خداوند نعمت "ی" گرتی ہوئی تو ضرور معلوم ہوتی ہے مگر جلال کا دعویٰ ہے اس لیے تامل ہوتا ہے"۔ مگر وہاں نقار خانے میں طوطی کی آواز کیا وقعت رکھتی تھی۔ ان کے قول کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور زور شور کے ساتھ جلال کے نام خط لکھا گیا کہ تم اسی منہ پر استادی کا دعویٰ کرتے ہو کہ نو شعر کی غزل میں تین حرفوں کے اسقاط سے بچنے کا دعویٰ کیا مگر بچ نہ سکے اور آخری شعر میں "ی" گرا گئے!

جس وقت یہ خط حکیم صاحب کو ملا تو اچھل پڑے کہ وار چل گیا اور جواب میں تحریر کیا کہ میں تو سمجھتا تھا کہ حضور کا دربار کملائے فن سے معمور ہے، مگر یہ غزل بھیج کر واضح ہو گیا کہ کسی کو موزوں پڑھنا بھی نہیں آتا۔ یہ جواب کس شوق سے سر دربار پڑھا گیا ہوگا اور اس کے سننے کے بعد لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی اسے خود سمجھ لیجیے مگر اس وقت بحر کی بن پڑی اور کہنے لگے کہ حضور میں نے کیا عرض کیا تھا۔ جواب لکھنے میں جلدی کی گئی جس سے سب کی عزت اور اعتبار پر حرف آیا۔

اس واقعے کے بعد پھر حضرت جلال طلب نہیں کئے گئے۔

ریاست منگرول سے وابستگی

حکیم صاحب جب آخری مرتبہ نواب صاحب سے خفا ہو کر لکھنؤ آئے تو جہاں وطن میں آنے کی خوشی تھی وہاں سلسلۂ معاش منقطع ہونے کا رنج بھی تھا۔ مگر خدا تو بڑا مسبب الاسباب ہے۔ حسب اتفاق اسی زمانے میں تذکرۂ ضیغم کے نام سے حالات شعرا میں ایک کتاب دکن سے شایع ہوئی۔ یہ کتاب نواب شیخ حسین میاں والی منگرول کے ملاحظے سے بھی گزری۔ کتاب میں جلال کے حالات بھی مع نمونۂ کلام درج تھے۔ نواب صاحب نے شیخ محمد عمر جنون سے ارشاد کیا کہ یہ شخص قابل قدر ہے۔ نواب صاحب کے ایما سے خط لکھا گیا اور ۱۳۰۴ھ میں حکیم صاحب دربار منگرول میں پہنچے۔

یہاں سے روانگی کے وقت تار دیدیا گیا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ حکیم صاحب فلاں گاڑی سے پہنچیں گے تو محمد عمر صاحب جنونؔ جو نواب صاحب کے میر منشی (پرائیویٹ سکریٹری) ہونے کے علاوہ وکیل سرکار بھی تھے، چند اور ارکان دولت کو ساتھ لے کر استقبال کے لئے گئے۔ حکیم صاحب اس اعزاز و احترام کے ساتھ دربار میں پہنچے اور نواب صاحب کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا اُسی وقت خلعت سے سرفراز ہوئے۔ ایک سو پچیس روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا، سرکاری مکان رہنے کو ملا اور دو آدمی خدمت پر مامور ہو گئے۔

متروک الفاظ کا دیوان سے اخراج

وہاں کے حالات بھی مفید و دلچسپ ہیں مگر اختصار کے خیال سے صرف لکھ جاتے ہیں۔ ایک روز نواب صاحب نے فرمایا کہ آپ نے جن الفاظ کو بعد میں ترک کیا ہے اور پہلے، دوسرے دیوان میں وہ لفظیں موجود ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اُنھیں بھی اپنے کلام سے نکال دیجیے۔ حکیم صاحب نے دونوں دیوانوں سے وہ الفاظ دبے مگر یہ سرکاری دیوان تھے اور وہیں رہے۔ عام طور پر جو دیوان لوگوں کے پاس ہیں وہ اُسی طرح ہیں جس طرح چھپے تھے۔

ایک اتفاق

جب نواب صاحب ہوا خوری کو نکلتے تھے تو حکیم صاحب کی قیام پر پہلے تشریف لاتے تھے اور اپنے ساتھ گاڑی پر بٹھا کر ہوا خوری کو لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عجیب اتفاق ہوا ایک تنگ راستے پر کچھ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ گاڑی وان نے وہاں گاڑی موڑنا چاہی۔ گاڑی مڑی تو مگر اس کے کرّے ٹوٹ گئے۔ گھوڑے عربی تھے فوراً رک گئے۔ ملازمین نے نواب صاحب کو اُتارنا چاہا۔ فرمایا "پہلے حکیم صاحب کو اُتارو کہ ضعیف آدمی ہیں"۔ آخر جب حکیم صاحب کو اُتروا لیا تو خود گاڑی سے اُترے۔ اسی وقت دوکانداروں نے اُٹھ کر چوٹیاں، اٹھنیاں نچھاور کرنا شروع کیں اور فوراً ایک بزاز نے نہایت عمدہ قالین نکال کر بچھا دیا۔

مرثیے کی بیت

حکیم صاحب تو گاہ گاہ یاد فرمانے پر دربار میں جایا کرتے تھے مگر حکیم صاحب کے داماد میر محمد نظیر صاحب مقال بلاناغہ حاضر دربار رہتے تھے۔ محرم کا زمانہ تھا نواب صاحب اپنے یہاں کی مجلس میں کبھی کبھی خود بھی مرثیہ پڑھا کرتے تھے جسب اتفاق مرثیہ پڑھنے والے تھے اُس میں گھوڑے کی تعریف کے چار مصرعے تو رہ گئے اور بیت غذ نچ جانے سے غائب ہو گئی۔ نواب صاحب نے مقال سے کہا "اس کی بیت حکیم صاحب سے کہلوا لائیے"۔ انھوں نے کہا "وہ مرثیہ کہنا نہیں جانتے" نواب صاحب نے فرمایا "وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ جا کے کہیے وہ ابھی کہہ دیں گے"۔

میر محمد نظیر صاحب جناب جلال کے کے پاس آئے اور نواب صاحب کی فرمائش بیان کی۔ حکیم صاحب نے چاروں مصرعے پڑھوا کر سنے اور فوراً یہ بیت کہہ کر لکھوا دی۔

طاؤس کی ہے چال، چلن کبک دری کا
آہو کا چھلاوا ہے، جھمگڑا ہے پری کا

جس وقت نواب صاحب نے یہ بیت دیکھی پھڑک گئے اور میر محمد نظیر سے کہا "دیکھا آپ نے، اب کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ بیت علاحدہ سے کہی گئی ہے یا خود مصنف نے کہی ہوئی ہے؟"

پنڈت پیم نرائن کے ساتھ مروّت کا برتاؤ

پنڈت پیم نرائن کان پور کے باشندے اور اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے ایک مثنوی لکھی تھی جس کا نام "بہار کشمیر" رکھا تھا۔ یہ مثنوی اردو میں تھی۔ ایک فارسی کا قصیدہ نواب شیخ حسین میاں رئیس منگرول کی مدح میں کہہ کر مثنوی کے ساتھ نواب صاحب موصوف کی خدمت میں بھیج دیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اسے حضور کے نام نامی سے معنون کرنا چاہتا ہوں۔ حکیم جلال صاحب اس زمانے میں وہیں موجود تھے۔ نواب صاحب نے مثنوی حکیم صاحب کے پاس بھیج دی اور کہلا بھیجا کہ آپ اسے دیکھ دیں۔ اگر اس میں کوئی غلطی نہ ہو تو میں اسے اپنے نام سے معنون کرنے کی اجازت دے دوں۔

یہ نئی بات نہ تھی بلکہ جب کبھی کوئی شاعر اُن کی مدح میں کچھ کہہ کر لاتا تھا تو نواب صاحب اُسے پہلے حکیم صاحب کو دکھا کر اطمینان کر لیتے تھے پھر اس کے چھپنے کی اجازت دیتے تھے حکیم صاحب نے مثنوی کو بغور ملاحظہ کیا اور جہاں جہاں قابل ترمیم تھی حاشیے پر لکھ دیا۔ نواب صاحب نے مثنوی مصنف کو واپس کی اور لکھوا دیا کہ اگر ان عیوب کو آپ دور کر دیجیے تو میں آپ کی خواہش کے موافق اجازت دیدوں۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ میں جلال کا شاگرد نہیں کہ اُن کے اعتراضات تسلیم کر لوں یا اصلاح کی اجازت دیدوں۔

مگر جب حکیم صاحب لکھنؤ واپس آئے تو ایک روز پنڈت پیم نرائن صاحب آئے اور کہا کہ درحقیقت میں غلطی پر تھا اور آپ کے اعتراضات بالکل بجا تھے۔ اب میری التجا ہے کہ آپ اس کی اصلاح بھی فرما دیں اور سفارش بھی کر دیں کہ میرا کام بن جائے۔ حکیم صاحب انتہا کے بامروت تھے۔ مثنوی رکھ لی اور درست کر کے سفارشی خط لکھ بھیجا۔ نواب صاحب نے روپیہ بھیج دیا اور لکھ بھیجا کہ آپ خود چھپوا کر مصنف کو دے دیں اور کچھ نسخے یہاں بھی بھیج دیں۔ حکیم صاحب نے مثنوی کی تاریخ طبع بھی کہی اور چھپوا کر کچھ جلدیں نواب صاحب کو بھیج دیں اور باقی مصنف کے حوالے کر دیں۔

"بہار کشمیر" کی طباعت کا قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

کانپوری ہیں جو اک پیم نرائن پنڈت
ناظم ملک سخن شاعر بے مثل و نظیر
کہہ کے اک مثنوی تازہ انھوں نے فی الحال
اور اسے کر کے مسمّٰی بہ "بہار کشمیر"
جلد تر پیش کشِ والی منگرول کیا
تاکہ چھپ کر ہو وہ مشہور جہاں بے تاخیر
اس کے نیرنگ سے بے رنگ ہے گلزار نسیم
کھوئے جس کا اثر اگلوں کے سخن کی تاثیر
طبع کا سال بھی کیا خوب شگفتہ ہے، جلال
لائی پاکیزہ شگوفے یہ بہارِ کشمیر
۱۳۰۵ھ

ال کی دعوت ولیمہ

حکیم صاحب نے اپنے لائق فرزند حکیم محمد مہدی صاحب کمال کی شادی کی اور
س لے کر منگرول گئے۔ نواب صاحب سے عرض کیا "میں نے لڑکے کی شادی کر دی
اور اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ حضور بھی دعوت ولیمہ قبول فرمائیں" نواب
حب نے دعوت قبول کی۔ حکیم صاحب نے اپنی قیام گاہ پر، محمد عمر صاحب کے
ام میں دعوت کی۔ نواب صاحب مع اعزا و ارکان ریاست تشریف لائے۔
صہ تناول فرمایا اور چلتے وقت کمال کو خلعت اور ایک سو ایک روپیہ علاوہ زادراہ
دے کر رخصت کیا۔

چند دن رہنے کے بعد حکیم صاحب نے نواب صاحب سے اپنی پیرانہ سالی کا
ر کیا اور کہا کہ "میرا وطن یہاں سے بہت دور ہے، اب میں بار بار اتنی بڑی زحمت
ر برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا ہوں"۔ نواب صاحب نے پچاس روپیہ
وار مقرر کر دیا اور لکھنؤ میں رہنے کی اجازت دے دی۔

ست رام پور سے دوبارہ وابستگی

کچھ دن بعد یہ دور بھی ختم ہوا۔ شیخ حسین میاں نے بھی انتقال فرمایا اور حکیم صاحب
شاہرہ موقوف ہو گیا۔ مگر اب وہ زمانہ تھا کہ رام پور کا دور انقلاب ختم ہو چکا تھا، نواب
حامد علی خاں بہادر نبیرہ نواب کلب علی خاں ولایت سے واپس آکر تاج فرماں روائی
ن چکے تھے اور کسی خاص سبب سے بنج کے طور پر لکھنؤ تشریف لا کر حسین آباد کی تالاب
لی کوٹھی میں جہاں شاہان اودھ کی تصویریں لگی ہوئی ہیں قیام پذیر تھے۔ حکیم صاحب
نے ولی نعمت کے جانشین سے ملنے گئے۔ نواب صاحب نے بلایا اور پوچھا "کہیے حکیم
احب، اب کن شعراء سے ہنگامہ آرائی رہتی ہے؟" حکیم صاحب نے کہا "حضور وہ
ر گزر گیا، نواب صاحب خلد آشیاں کے عہد تک اس کا لطف تھا۔ جب اُن سا
ر شناس نہ رہا تو میں بھی گوشہ نشین ہو گیا" نواب صاحب نے فرمایا "آپ رام پور
آکر مجھ سے ملیے گا"، مگر حکیم صاحب نہیں گئے۔ آخر وہاں سے پروانہ آیا اور طلبی ہوئی۔

اب حکیم صاحب گئے۔ نواب صاحب نے بہت عزت کی اور پوچھا کہ آپ کا کیا مشاہرہ تھا۔ حکیم صاحب نے بیان کیا، انھوں نے وہی ساٹھ روپیہ مہینہ کر دیا اور حکیم صاحب وہاں رہنے لگے۔

مگر اب حکیم صاحب کا جی کیا لگتا۔ نہ امیر تھے نہ داغ۔ نہ قلق تھے نہ بحر۔ نہ عزیز تھے نہ مفتی سعد اللہ۔ چند ہی روز میں اُکتا گئے اور نواب صاحب سے عرض کی کہ "میں نہ تو اہل و عیال کو بلا سکتا ہوں نہ تنہا رہ سکتا ہوں۔ نہ کسی کام کا ہوں۔ یہاں بھی حضور کے لیے دعا کرتا ہوں اور وطن میں رہ کر بھی دعا کرتا رہوں گا۔" نواب صاحب نے فرمایا کہ "آپ کے یہاں رہنے سے میری ریاست کا نام ہے۔" کچھ دنوں بعد پھر حکیم صاحب نے کہا کہ "اب میری جگہ پر بندہ زادے کو قبول فرمائیے۔ اگرچہ وہ ریاست ترہ میں ملازم ہے مگر اسے بلا لوں گا۔" نواب صاحب نے قبول فرمایا اور کہا کہ "اگر آپ کے بیٹے آجائیں گے تو پھر میں جانے کی اجازت دے دوں گا۔" چنانچہ حکیم صاحب نے کمال کو خط لکھ کر بلا لیا۔ نواب صاحب نے پچھتر روپیہ ماہوار کمال کے مقرر کیے اور پچاس روپیہ ماہوار حیاتی پنشن کے طور پر حکیم صاحب کے کر دیے۔ حکیم صاحب وطن میں رہنے لگے۔

لکھنؤ کے قیام کا زمانہ

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ریاست منگرول سے وابستگی کے زمانے میں بھی ایک مدت تک حضرت جلال لکھنؤ میں رہے اور رامپور سے دوبارہ تعلقات قائم ہو جانے کے بعد بھی عمر کا آخری حصہ یہیں گزارا۔ علاوہ اس کے دوران قیام رام پور و منگرول میں بھی اکثر لکھنؤ تشریف لاتے تھے۔ قیام لکھنؤ کے ان مختلف زمانوں کے چند مختصر لیکن دلچسپ و مفید حالات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

جلال کی پاک باطنی اور انصاف پسندی

جلال اسم بامسمیٰ تھے اور غصہ ان کا مشہور تھا۔ یہ غصہ جہالت کی وجہ سے نہ تھا۔ وہ علاوہ علوم رسمیہ کے فارسی و عربی میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ مذہبی بحثوں میں حدیث و قرآن سے استدلال لایا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت حق پسند تھی۔ جو اُن کا

دل تھا وہی ان کی زبان تھی۔ پھر اس فریبی دنیا میں ان کے غصے کے لیے اسباب کی کیا کمی تھی۔ وہ اپنے معاصرین امیر و داغ سے محبت رکھتے تھے اور اُن کی عزت اپنی عزت جانتے تھے۔ ایک مرتبہ احسان علی خاں احسان شاہ جہاں پوری نے ایک غزل کہہ کر بھیجی۔ وہ غزل داغ کی ہم طرح غزل تھی۔ یہاں تک تو مضایقہ نہ تھا کہ ایک طرح میں سب ہی طبع آزمائی کیا کرتے ہیں مگر احسان نے لکھ بھیجا کہ میں نے داغ کی غزل کا جواب کہا ہے اور بعض اشعار پر داد خواہ بھی ہوئے۔ یہ امر استاد کو ناگوار گزرا، غزل کاٹ کر رکھ دی اور جواب لکھا کہ "تمہارا ابھی یہ منہ ہے کہ تم داغ کی غزل کا جواب کہو گے۔ داغ کی غزل کا جواب ہم کہیں یا ہماری غزل کا جواب داغ کہیں۔ تم جیسے ہمارے شاگرد ویسے داغ کے شاگرد۔" احسان خاں، صاحب دیوان اور صاحب تلامذہ تھے۔ مگر استاد کی ایک ڈانٹ نے چڑھے ہوئے پارے کو اُتار دیا اور انھوں نے ایسی جرأت پھر کبھی نہیں کی۔

داغ کے ایک مقطع سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھیں بھی اپنے حریفانِ سخن سے محبت تھی اور ان کا فراق شاق تھا۔ کہتے ہیں ؎

اے داغ ہے دکن سے بہت دور لکھنؤ
ملتے امیر احمد و سید جلال سے

لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں یہاں کے شاگرد برابر حاضر ہوتے رہتے تھے۔ کبھی کسی اصلاح کی غرض سے کبھی کسی استفسار کے لیے، کبھی صرف سلام کو۔ ایک مرتبہ حکیم مرزا فدا احمد صاحب دانش پہنچے اور نواب مہدی حسن خاں رفعت کی شکایت کی کہ انھوں نے میرے شعر پر اعتراض کر دیا۔ حکیم صاحب نے پوچھا کہ شعر کیا ہے اور اعتراض کیا ہے۔ دانش صاحب نے ذیل کا شعر پڑھا ؎

اس قدر طول، یہ بڑھنا، یہ درازی، توبہ
حشر میں تجھ سے خدا، اے شبِ ماتم، سمجھے

حکیم صاحب نے فرمایا کہ شبِ ماتم کیا چیز ہے۔ دانش صاحب نے کہا "جیسے شبِ غم ویسے شبِ ماتم۔ مگر رفعت کہتے ہیں کہ شبِ ماتم، شبِ غم کے معنی میں، غلط ہے۔" حکیم صاحب نے فرمایا وہ ٹھیک کہتے ہیں آپ یہ شعر نکال ڈالیے یا لفظ بدل دیجیے۔

دانش صاحب اہل علم سے تھے اور مہدی حسن خاں رفعت معمولی استعداد کے آدمی۔ دانش کو حکیم صاحب کا یہ فیصلہ ناگوار معلوم ہوا۔ اُسی روز سے استاد کے خلاف ہو گئے، شاگردی سے انکار کرنے لگے۔ ہمیشہ استاد پر اعتراض کرنے کی فکر میں رہا کرتے تھے اور اپنے کو میر علی ضامن خلف جناب رشک کا شاگرد ظاہر کیا کرتے تھے۔ مگر جلال کی انصاف گستری اور حق گوئی ایسی باتوں سے متاثر ہونے والی نہ تھی۔

جلال کے کمال کا مونس کی زبانی اعتراف

میرے والد مرحوم میر ذاکر حسین صاحب یاس شاعری میں میر نواب صاحب مونس کے شاگرد ہوئے۔ ایک مرتبہ والد مغفور نے میر مونس سے علم عروض پڑھنے کی خواہش کی۔ مونس نے کہا کہ اگر تمھیں عروض داں بننا ہے تو میرے بدلے جلال سے پڑھو کہ اُن سے بہتر عروضی کوئی نہیں ہے۔ اسی بنا پر میر مونس کے بعد والد مرحوم نے حکیم صاحب سے رجوع کی اور عمر بھر تحصیل فن کرتے رہے۔

جلال کی عزلت گزینی اور ماہر و فاخر کے مشاعرے

اہلِ لکھنؤ کسی ہم وطن کے عروج کو نہ پہلے دیکھ سکتے تھے نہ اب دیکھ سکتے ہیں۔ جناب جلال نے یہاں کی فضا مکدر دیکھ کر مشاعروں کی شرکت ترک کی اور خانہ نشین ہو گئے۔ اس احتیاط سے بھی پوری طور پر عافیت نصیب نہ ہوئی۔ کہیں نہ جانا تو اپنے اختیار کی بات تھی لیکن دوسروں کو آنے سے منع کرنا اور کسی سے نہ ملنا سراسر خلاف اخلاق ہونے سے اختیار کے باہر تھا۔ لوگ آتے تھے اور جو نکات سمجھ میں نہ آتے تھے پوچھ جاتے تھے۔

اسی زمانے میں مولوی میر مہدی حسین[1] صاحب ماہر اور مولوی میر اصغر حسین[2] صاحب

---

[1] مولوی میر مہدی حسین صاحب ماہر غفراں مآب مولوی دلدار علی حلب کے پوتے تھے اور شاعری میں منشی اسیر کے شاگرد تھے۔ کہنہ مشق اور خوش فکر شعرا میں ان کا شمار تھا اور نواب تاج محل کے داماد ہونے سے رؤسا میں گنے جاتے تھے۔ (حاشیہ ۲ صفحہ ۶۳ پر)

فاخر کربلائے معلیٰ سے لکھنؤ آئے۔ یہ لوگ حق دامادی سے نواب تاج محل[1] کے وارث جائز ہو چکے تھے۔ زر و جواہر سبھی کچھ تھا، جو بعد میں بہت جلد اور بہت بُری طرح برباد ہو گیا۔ ماہر صاحب کے یہاں تو گاہ گاہ مشاعرے ہوتے تھے مگر فاخر صاحب کے یہاں ہر پندرہویں روز مشاعرہ ہوتا تھا۔ قیام ان کا نرہی میں تھا۔ یہ جگہ شہر کے مشرق جانب فاصلے پر ہے۔ شعرا کو گاڑی کا کرایہ بھی ملتا تھا اور سب کے لیے اِک پر تکلف دسترخوان بھی بچھتا تھا۔ جو شخص فاخر صاحب کا شاگرد ہوتا تھا اُس کا کچھ مشاہرہ بھی مقرر ہو جاتا تھا جو دس روپئے سے کم نہ ہوتا تھا۔ شعرائے نامی میں سوا جلال کے کوئی ایسا نہ تھا جو ان مشاعروں میں شریک نہ ہوتا ہو۔

مشاعرے کا مثنیٰ

اس مشاعرے کا ایک مثنیٰ بھی ہوتا تھا۔ یہ صحبت مختصر ہوتی تھی اور اس میں صرف اساتذہ پڑھتے تھے۔ اس مختصر صحبت میں بڑے اصرار پر ایک مرتبہ حکیم صاحب بھی شریک ہوئے تھے اور مجھے بھی اپنے ہم راہ لیتے گئے تھے۔ یہاں بھی جلال کا بزرگانہ امتیاز قائم رہا کہ آخر میں پڑھے اور اثناء خوانندگی میں لوگوں نے داد دیتے وقت اُن کو اپنے عہد کا میر کہا۔

ماہر کی کشیدگی

اسی سلسلے میں ماہر و فاخر حکیم صاحب کے یہاں آتے تھے اور دو دو پہر نشست رہا کرتی تھی۔ اپنی طولانی غزلیں پڑھتے تھے جس سے حکیم صاحب بہت پریشان ہوتے تھے اور ان کے جانے کے بعد لوگوں سے شکایت کیا کرتے تھے۔

بقیہ حاشیہ سلسلہ صفحہ ۶۲: [2] مولوی میر اصغر حسین صاحب فاخر، ماہر صاحب کے بھانجے بھی تھے اور شاگرد بھی اور نواب تاج محل کے نواسی داماد تھے، ان کا شمار بھی روسا میں تھا۔

[1] نواب تاج محل نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی بیگم تھیں۔ وہ بیوہ ہونے کے بعد کربلائے معلیٰ چلی گئیں اور عمر بھر وہیں رہیں۔

فتنہ انگیزوں نے یہ خبر ماہر و فاخر سے بھی بیان کی۔ انھیں ناگوار ہوا۔ ایک روز حکیم صاحب جناب ماہر سے ملنے گئے۔ وہاں کامل صاحب[1] بھی موجود تھے۔ حکیم صاحب کی تعظیم تو ہوئی مگر دیر تک ایک سکوت کا عالم رہا۔ حکیم صاحب نے سکوت کا سبب دریافت کیا۔ ماہر صاحب بھرے بیٹھے ہی تھے کہنے لگے "آپ تو اپنے آگے کسی کو موجود نہیں جانتے ہیں۔" حکیم صاحب نے کہا "یہ آپ نے کیوں کر جانا؟" غرض کہ حجت بڑھی، آخر جلال کو جلال آ ہی گیا، کہنے لگے "اگر درحقیقت میں اپنے آگے کسی کو موجود نہ جانوں تو یہ بے جا کیا ہے؟" اس جواب کا کوئی جواب نہ ملا اور حکیم صاحب وہاں سے استغفراللہ کہتے ہوئے اٹھے اور پھر نہ کبھی یہ گئے اور نہ وہ آئے۔

جلال کے خلاف پروپیگنڈہ اور جلال کی عالی ظرفی

اسی طرح حکیم صاحب ایک روز میر جعفر حسین فاخر کی ملاقات کو گئے۔ وہاں میاں عصمت ریختی گو موجود تھے۔ جب حکیم صاحب اٹھ کے چلنے لگے تو میاں عصمت نے اپنی بکواس کی تان اس جملے پر توڑی۔ "حضور مجھ سے اور میاں جلال سے نہیں بنتی۔" حکیم صاحب نے اُن کی صورت دیکھی اور کہا "آپ جلال کو پہچانتے بھی ہیں؟" کہنے لگے "جی ہاں میرے اُن کے خوب خوب بحثیں ہو چکی ہیں۔" حکیم صاحب جھلا کر کہنے لگے "جلال تو میں ہوں!" اور میر اصغر حسین کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھیے لوگوں نے اس طرح مجھے بدنام کیا ہے۔" عصمت بھی بوڑھے آدمی تھے۔ بہت خفیف ہوئے اور معافی مانگنے لگے۔ حکیم صاحب نے معاف کیا اور فرمایا کہ "اگر مجھے بُرا کہنے میں تمہارا کوئی فائدہ ہو تو میں آئندہ کے لیے بھی معاف کرتا ہوں۔"

انھیں میر اصغر حسین صاحب کے مشاعروں میں ایک مرتبہ مولوی لڈن صاحب[2]

---

[1] علی میاں نام تھا، کامل تخلص، مولوی محمد علی صاحب کے بیٹے تھے، خود بھی صاحب علم و فضل تھے۔ مرثیہ گوئی اور غزل گوئی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے اور اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔

[2] سید محمد اصطفا نام، لڈن صاحب عرفیت اور خورشید تخلص تھا۔ یہ بھی مولوی دلدار علی صاحب کے داماد تھے۔ شاعری میں ان کا سلسلۂ تلمذ آغا ہجو ہندی سے ملتا ہے۔ افادات کے نام سے علم عروض

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵ پر)

خورشید اپنی غزل پڑھ رہے تھے جب یہ مصرع پڑھے ؎

"اک شامیانہ اور تہِ شامیانہ ہو"

تو نواب بنّے صاحب[1] مشتاق نے اعتراض کیا کہ شامیانہ فارسی نہیں لہذا یہ اضافت غلط ہے۔ خورشید صاحب حکیم صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ اس کا جواب بتائیے ورنہ میری بات جاتی ہے اور اعتبار میں فرق آتا ہے۔ باوجودیکہ حکیم صاحب جانتے تھے کہ یہ میرے دوست نہیں ہیں مگر وعدہ کر لیا اور کہا کہ "میں فارسی کلام سے مثال نکال دوں گا، مگر یہ بھی سن رکھیے کہ شامیانہ فارسی ہے نہیں اور اعتراض بالکل صحیح ہے۔" پھر حکیم صاحب نے فارسی گویوں میں سے خدا جانے کس کے کلام سے مثال نکال کر بھیج دی۔

• حکیم صاحب مشتاق کے متعلق اچھی رائے رکھتے تھے اور رؤسائے لکھنؤ میں مرزا والاجاہ بہادر[2] المتخلص بہ عاشق کو اور نواب مہدی علی خاں صاحب مہدی نیشاپوری[3] کو اساتذہ میں شمار کرتے تھے۔

جلال کی سادہ لوحی

ربیع الاول کی آٹھویں تاریخ ہے، حکیم صاحب اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے ہیں کہ سامنے سے محلے کے ایک شخص مرزا رضا علی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ یہ حضرت بالکل جاہل مگر بہت شوخ طبع تھے۔ آئی پر چوکنا اُن کے مشرب میں وہ گناہ تھا جس کا کوئی کفارہ ہی نہ تھا۔ حکیم صاحب نے پوچھا "آپ کہاں سے آرہے ہیں"۔ کہنے لگے "چپ تعزیے کی زیارت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ صاحب تلامذہ تھے، اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔

[1] مرزا باقر علی خاں نام، بنّے صاحب عرفیت اور مشتاق تخلص تھا۔ رؤسائے لکھنؤ میں سے تھے اور شعر گوئی میں بھی مشتاق تھے ان کا شمار بھی اساتذہ میں تھا۔ [2] مرزا والاجاہ بہادر لکھنؤ کے بڑے رؤسا میں سے تھے۔ ان کے والد مرزا حیدر صاحب، شجاع الدولہ فرماں روائے اودھ کے نواسے تھے۔ یہ شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے، مطبوعہ دیوان موجود ہے۔ ان کا شمار بھی اساتذہ میں ہے، [3] نواب مہدی علی خاں صاحب بھی مرزا والاجاہ بہادر کے عزیز تھے۔ شاعری میں ماہر فن اور استاد کامل سمجھے جاتے تھے۔

کو گیا تھا، اب کے تو ایسا مجمع تھا کہ اکبری دروازے کے نیچے ہاتھی کچل گیا۔" حکیم صاحب نے فرمایا "یہ آپ نے کس سے سُنا؟" یہ حضرت ہر وقت تسبیح بھی لیے رہتے تھے۔ ہاتھ اُٹھا کر کہنے لگے "اس تسبیح کی قسم میں نے ہاتھی کو کچلتے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔" اب حکیم صاحب کو ہاتھی کے کچل جانے کا یقین آگیا۔ یہ قصہ اپنے ایک دوست میر حسین جان سے نقل کیا۔ انھوں نے کہا "حکیم صاحب، بھلا یہ بھی کوئی عقل میں آنے کی بات ہے؟" حکیم صاحب نے کہا "عقل میں تو میری بھی نہیں آتا مگر راوی ثقہ ہے اور اس نے قسم کھا کے کہا ہے۔" وہ ہنس کے چُپ ہو رہے اور حکیم صاحب کہہ کر پشیمان ہوئے۔ جب دوسرے روز مرزا رضا علی ملے تو اُن سے کہا "کیوں صاحب! آپ جھوٹ بھی بولتے ہیں اور اُس پر قسم بھی کھاتے ہیں۔ بھلا ہاتھی اتنا بڑا جانور، وہ آدمیوں کے مجمع سے کیوں کر کچل سکتا ہے؟" مرزا نے کہا "ایک ہاتھی کیسا، جتنے ہاتھی اُس کمہار کی دوکان پر رکھے تھے اگر سب گر پڑتے تو اتنا مجمع تھا کہ سب کچل جاتے!" حکیم صاحب نے کہا "استغفر اللہ" تو آپ نے کل ہی کہہ دیا ہوتا کہ وہ مٹی کا ہاتھی تھا۔" مرزا نے کہا، "یہ تو آپ کو خود سمجھ لینا چاہیئے تھا کہ اصل ہاتھی جب آدمیوں سے خود بلند ہوتا ہے تو وہ پاؤں کے نیچے کیوں کر آسکتا ہے۔" یہ کہہ کر راہی ہو گئے۔

جلال کے تصانیف

میں اپنے علم و یقین کے موافق حالات و واقعات بیان کر چکا۔ اب حضرت جلال کی مفید تصنیفات کی فہرست بھی دے دیتا ہوں جس کے دیکھنے سے اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ دنیائے ادب پر اس محقق باکمال کے کیا کیا احسانات ہیں اور لوگوں نے اُن سے کس قدر فائدہ اٹھایا۔

حضرت جلال کی تصنیفات و تالیفات بارہ ہیں جن میں سے دس مطبوعہ اور دو غیر مطبوعہ ہیں، مطبوعہ کتابوں میں اکثر کے نام تاریخی ہیں۔

مطبوعہ کتابیں:۔

۱۔ شاہد شوخ طبع۔ دیوان اول ہے، ۱۲۹۷ھ میں مرتب ہوا اور ۱۳۰۰ھ میں چھپا۔

۲۔ گرشمہ گاہ سخن۔ دیوان دوم ہے، ۱۳۰۱ھ میں مرتب ہوا اور ۱۳۰۲ھ میں چھپا۔

۳۔ افادۂ تاریخ۔ قواعد تاریخ گوئی کے متعلق ہے، ۱۳۰۳ھ میں طبع ہوئی۔

۴۔ منتخب القواعد۔ حروف کے خواص کے بیان میں ہے۔ ۱۳۰۴ھ میں طبع ہوئی۔

۵۔ گلشن فیض۔ فارسی زبان میں اردو لغت ہے، مطبع نول کشور میں چھپا تھا، اب کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔

۶۔ تحفۂ سخنوراں، یا سرمایۂ زبان اردو۔ اردو زبان میں اردو لغت ہے، ۱۳۰۴ھ میں طبع ہوا۔

۷۔ مفید الشعرا۔ تذکیر و تانیث کے بیان میں ہے، ۱۳۱۱ھ میں طبع ہوئی۔

۸۔ مضمون ہائے دلکش۔ دیوان سوم ہے۔ ۱۳۱۶ھ میں چھپا۔

۹۔ نظم نگاریں۔ دیوان چہارم ہے۔ ۱۳۲۱ھ میں چھپا۔

۱۰۔ تنقیح اللغات۔ صحت لغات میں ہے۔ مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ میرے پاس قلمی نسخہ ہے جس میں سنہ تالیف یا سنہ طباعت درج نہیں ہے۔

غیر مطبوعہ کتابیں:۔

۱۔ دیوان پنجم۔

۲۔ رسالہ عروض و قوافی۔

ان تصانیف کے مطالعے کے بعد ہر شخص یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ جس بزرگ نے ایسی ادب آموز کتابیں اپنی یادگار میں چھوڑی ہوں وہ دنیائے ادب میں کبھی گم نام نہیں رہ سکتا۔

مثنوی دُردانہ

قصۂ دل پذیر روپ نگر
عشق کی سیرگاہ حُسن کا گھر

جس کا ہر فرد انتخاب جہاں
جیسے انساں کے ڈیل بھر میں زباں

اُمرا جس میں شان کے مالک
غربا آن بان کے مالک

اُن میں سب سے زیادہ باوقعت
ایک نواب تھے فلک رفعت

جن کی ذات وصفت کا ایک ہی نام
منزلیں ارتقا کی جن پہ تمام

تھے کنیز و غلام و دولت و زر
گوہر بے بہا حسیں دختر

خوب رو، شاد کام نیک نہاد
باپ ماں کے دلوں کی زندہ مراد

چہرہ آئینہ شادمانی کا
پھول کھلتا ہوا جوانی کا

اک جھلک اس کی ایسے ہوش اڑائے
کہ نظر پلٹے دل پلٹ کے نہ آئے

خوب صورت بھی نیک سیرت بھی
دل رُبائی کے ساتھ عصمت بھی

پاک دامن اگر جھٹک کے بچائے
معصیت کا چراغ گُل ہو جائے

نام دُردانہ چہرہ مہ طلعت
گوہر شب چراغ خوش قسمت

کیسے ناز و نعم کی پالی تھی
باپ ماں کی مرادوں والی تھی

سولہویں گن کے نیک فال گرہ
ہوا تجویز جشن سال گرہ

کھل پڑے حوصلے طبیعت کے
پہنچے گھر گھر پیام دعوت کے

اک امیر اور منتوں سے بلائے
فخر سمجھے نہ کون، کون نہ جائے

کوئی گھر میں تھا کوئی راہ میں تھا
دل ہر اک شوق جشن گاہ میں تھا

تھی محل ہی کے پاس ایک زمین
اس کے دن پھر گئے ہوئی تزئین

چو طرف نصب خیمہ و خرگاہ
بیچ میں بارگاہِ عالی جاہ

تھی ضرورت جہاں بھی پردے کی
کی قناتوں سے اُس کی حد بندی

بن گئے رستے کھل گئے بازار
اک نیا شہر ہو گیا تیار

بچھے ایسے وسیع دستر خوان
کہ جہاں کھپتے جائیں سب مہمان

اللہ اللہ وقار دعوت کا
رزق اک جا تھا سب کی قسمت کا

لذتیں کیا بیاں ہوں کھانے کی
نعمتیں جمع تھیں زمانے کی

جا بجا گرم بزمِ رقص و غنا
وجد میں بام و در تھے مست فضا

اک طرف سوز میں بھرے ہوئے ساز
اک طرف جمع چیدہ آتش باز

اک شجر بن گیا چھٹا جو انار
آگ دکھلا رہی تھی اپنی بہار

ہر ہوائی تھی رشکِ تیرِ شہاب
دے رہی تھی زمیں فلک کو جواب

جاہی، جوہی، بتاسا اور نسرین
رشکِ مہتاب و غیرتِ پروین

ذکر تفصیل سے کروں کیوں کر
چاہیے ہر بیاں کو اک دفتر

جشن گہ تھی کہ آنکھ کی پُتلی
سمٹ آئی تھی جس میں کل بستی

سب وہ ساماں کہ جن سے دل مانوس
پھر بھی ہوتی تھی کچھ کمی محسوس

کہ نہ تھا وہ جوان باتمکیں
سارے قصبہ کی جان تھا جو حسیں

پھسلی پڑتی تھی جس پہ رعنائی
حُسنِ خود جس کا تھا تماشائی

یوں جوانی کا پاک ہر پہلو
اُٹھتے شعلوں پہ جیسے ہو قابو

شوق بھڑکا ہوا چراغ نہ تھا
دل کی رنگینیوں میں داغ نہ تھا

نہ وہ حاجت روا نہ حاجت مند
حیثیت سے سوا خیال بلند

نام مشہور خلق ناصر تھا
سب تھے حاضر وہی نہ حاضر تھا

یہ تمول کی تھی نہ سرشاری
بلکہ تھا مقتضائے خود داری

دل میں جا کر سکی نہ ایسی ہوس
خوانِ نعمت پہ بیٹھے بن کے مگس

عام دعوت سے بھی کراہت تھی
ردِ دعوت میں بھی ندامت تھی

کچھ عجب کش مکش میں تھا وہ غیور
عقل کرتی تھی فیصلے میں قصور

شور اُٹھا آگ آگ کا ناگاہ
چرخ نیلی ہوا دھوئیں سے سیاہ

اک ہوائی نے یہ قیامت کی
کہ قناتوں میں آگ دوڑ گئی

پڑ گیا پھول بارگاہ پہ بھی
آ گئی آنچ عزّ و جاہ پہ بھی

ہو گئی گُل بھڑک کے ہر قندیل
نغمے نالوں میں ہو گئے تبدیل

خیمے خیمے جو دوڑنے لگی آگ
پڑ گئی ہر طرف کو بھاگا بھاگ

ادب آداب کا کسے ہو خیال
تھا امیر و غریب کا اک حال

ہوش کس کو ہو یہ کہاں ہے کون
میزباں کون میہماں ہے کون

شعلے اُٹھ اُٹھ کے جاتے تھے تا دور
گر رہے تھے کباب ہو کے طیور

حد بنا کر زنان خانے کی
ایک دیوار آتشیں تھی کھڑی

لُو کے اُٹھتے جو دیکھے ناصر نے
بند پابندیوں کے توڑ دیے

حق ہمسائیگی کا دھیان آیا
فرضِ انسانیت نے گرمایا

پھر نہ کوئی خیال روک سکا
جان کا بھی نہ خوف ٹوک سکا

دوڑا اس طرح ہو کے دیوانہ
جانب شمع جیسے پروانہ

آ کے دیکھا کہ جمع ہے خلقت
سب مگر بے حواس و بے ہمّت

عورتیں دُور بیٹھتی ہیں کھڑی
ایک ہلچل سی ہر طرف ہے پڑی

ساز و سامان عیش ہیں جتنے
جل رہے ہیں دھڑ دھڑ کر کے

خاص جو ہے عروس کا حجلا
گرد اس کے ہے شعلوں کا پہرا

جس کے دم کی ہے روشنی ساری
بجھنے والی ہے شمع عمر اُس کی

سب کھڑے دیکھتے ہیں دور سے سیر
حالِ نوّاب نامدار ہے غیر

آگے بڑھنے میں خطرہ جان کا ہے
وقت ہمّت کے امتحان کا ہے

اتنا ایثار کس میں ہے جو دکھائے
جان دے سکتا ہو تو جان بچائے

ہے بپا حشر کا سا ہنگامہ
ایک عالم ہے نفسی نفسی کا

پڑ کے خطرہ میں جو مدد کرتا
اتنے مجمع میں بس وہ ناصر تھا

جلد تر دامنوں کو گردانا
آستینیں اُلٹ کے آگے بڑھا

دل تھا موم اس کا، عزم آہن تھا
لب پہ یا نارُ کُونِی بَرْدًا تھا

اُٹھتے شعلوں میں یوں وہ در آیا
چاند گویا شفق میں ڈوب گیا

پھر تو تھا لالہ زار آگ نہ تھی
رہ گیا رنگ مٹ گئی گرمی

پہنچا کیوں کر وہ تابہ دردانہ
نظر اس رانسے ہے بے گانہ

نکلا تو آگ روندتا نکلا
برق کی طرح کوندتا نکلا

یوں تھی آغوش میں وہ مہ پارا
جیسے چمکے ہلال میں تارا

ہاتھ دونوں تھے زیرِ پشت و کمر
سینہ سینے پہ شانہ تکیۂ سر

سب کی نظریں ادھر لگی ہوئی تھیں
معادل کا آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں

ناصر اس آن بان سے نکلا
مرحبا ہر زبان سے نکلا

بے تحاشہ جھپٹ پڑے نواب
آنکھ مشتاق دید دل بے تاب

جلد آہ و فغان کی داد ملی
دلِ مایوس کی مراد ملی

پا کے اپنا وہ گوہر شہ وار
بند تھے لب نگاہیں شکر گزار

لے کے سوئے زنان خانہ چلے
بن کے امید کا فسانہ چلے

گرد ناصر کے ایک مجمع تھا
لب پہ تھا واہ، واہ کیا کہنا

میہمان اپنے اپنے گھر پلٹے
نوجواں کو دعائیں دیتے ہوئے

اُس چراغاں کے بعد یہ اندھیر
جا بجا تھے زمیں پہ راکھ کے ڈھیر

دم میں سارا نظام برہم تھا
ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا

ہوئے داخل محل میں جب نواب
گرد تھیں عورتیں بحالِ خراب

ماں تو دیوانہ وار گرد پھری
لیں چٹاچٹ بلائیں بیٹی کی

وہم ہر طرح کے گزرنے لگے
صدقے چلے سبھی اترنے لگے

سہمی سہمی سی کچھ تھی دُردانہ
کہ تصور میں تھا وہی نقشہ

آگ وہ چار سمت بیچ میں آپ
الفتیں سوخت، ختم میل ملاپ

کون تھا جو نہ غل مچاتا تھا
پاس لیکن کوئی نہ آتا تھا

مٹتے ہر اعتبار دیکھ لیا
باپ ماں کا بھی پیار دیکھ لیا

جز اجل کون آنے والا تھا
بس خدا ہی بچانے والا تھا

وہی حافظ ہے ہر جگہ لا ریب
جس کا بھیجا ہوا فرشتۂ غیب

نہ ڈرا آگ سے نہ گھبرایا
بن کے پیغام زندگی آیا

پایا شعلوں پہ کس طرح قابو
آگ سے کیا سوا تھا گرم لہو

آن کی آن یوں وہ لے نکلا
لے اُڑے پھول جیسے تیز ہوا

دل کی صورت بدن میں بھی نرمی
جس کی اب تک ہے جسم میں گرمی

مَس ہوا تھا جو غیر مرد سے جسم
کانپ اٹھتا تھا آہِ سرد سے جسم

دل میں طوفان جوش و حسرت کا
اور پسینہ جبیں پہ غیرت کا

یادِ ناصر جو گدگداتی تھی
جھرجھری سی بدن میں آتی تھی

دل میں احساسِ بارِ احساں تھا
نہ مگر شکریہ کا امکاں تھا

اس تصور میں کھو گئی وہ تو
جیسے بے ہوش ہو گئی وہ تو

اب ادھر کا بھی ماجرا سنیے
حال ناصر کا بھی ذرا سنیے

یہ بھی پلٹا تو داغ کھائے ہوئے
دل میں چنگاری اک دبائے ہوئے

سکۂ ایثار کا جما کے پھرا
تابِ صبر و سکوں گنوا کے پھرا

اور کی آگ تو بجھا آیا
آپ چرکا جگر پہ کھا آیا

یادِ پیہم سے تھا نہ دل کو قرار
پھونکے دیتے تھے آتشیں رخسار

شامِ غم تھی ہر ایک شام اُسے
خواب و خور ہو گیا حرام اُسے

فرقِ معمول میں جو آنے لگا
خوفِ افشائے غم ستانے لگا

دوستوں میں وہ خوش دلی نہ رہی
وہ ہنسی اور دل لگی نہ رہی

گر ہنسا بھی ہنسی تو کھسیانی
پردہ ٹھہرا بنائے عریانی

آنسو پی پی گیا وہ دانشمند
بہتے دریا پہ جیسے باندھ دیں بند

راز تھا دل رُبا کا جان کے ساتھ
عشق اور ایسی آن بان کے ساتھ

ملنا جلنا ہر اک سے چھوڑ دیا
رشتۂ ارتباط توڑ دیا

جن سے روزانہ رہتی تھی صحبت
دفعتاً اُن سے ہو گئی فرقت

اب بھی سب بیٹھتے تو تھے یکجا
لطفِ صحبت مگر نہ آتا تھا

یہی ان میں چہکتا بلبل تھا
یہی پھولوں میں سرسبد گل تھا

چپ تھے افسردگی میں سب احباب
کیونکہ سازِ طرب تھا بے مضراب

گو زمانے میں دوست ہیں معدوم
پھر بھی ہر ایک تو نہیں محروم

اچھے اچھوں کو مل ہی جاتے ہیں
جو بُرے وقت کام آتے ہیں

باہم اک روز مشورہ یہ ہوا
چل کے دیکھیں کہ ماجرا ہے کیا

لطف سے پرسشِ مزاج کریں
ہو جو بیمار تو علاج کریں

کچھ خفا ہو اگر تو سمجھائیں
اپنے روٹھے کو پھر منا لائیں

آئے سب مل کے گھر پہ ناصر کے
اور بستر کو گھیر کر بیٹھے

منہ لپیٹے پڑا تھا یوں وہ نزار
جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار

پاؤں اُٹھ کر کوئی دبانے لگا
منہ سے چادر کوئی ہٹانے لگا

ایک نے ہاتھ نبض پر ڈالا
دوسرا دیکھنے لگا ماتھا

ایک بولا مزاج کیسا ہے
دوسرے نے کہا کہ نبض ہے

دیکھنے میں پڑا ہوا ہے نڈھال
نبض گھوڑے کی چل رہی ہے چال

نہ اٹھیں سیدھی طرح گر حضرت
کر دو دو چار گھونسوں سے دعوت

ابھی جاتی رہے گی بیماری
ساتھ یاروں کے کیسی خودداری

ایک بولا کہ بات کچھ ہے ضرور
نہیں بیمار اگر تو ہے رنجور

دل پہ صدمہ کوئی اُٹھایا ہے
نہیں یہ بھی، تو دل لگایا ہے

دوست آخر سبھی طرح کے تھے
اور سبھی اپنی اپنی کہتے تھے

کس کو کس کو جواب وہ دیتا
اور کہتا بھی گر تو کہتا کیا

طرہ سب پر تھی یاد یار اُسے
جو بنائے تھی رازدار اُسے

ایک سی ایک اَن کہی جو سُنی
کبھی غصّہ کبھی ہنسی آئی

گھٹ رہا تھا غریب کرتا کیا
بھر کے اک ٹھنڈی سانس اُٹھ بیٹھا

پھر تو سب سیٹیاں بجانے لگے
کامیابی کے گیت گانے لگے

ایک بولا بہت بنے بھائی
دوسرے نے بنایا سودائی

اسی صحبت کا ایک یہ بھی تھا
رہتا کب تک بنا ہوا گونگا

جل کے بولا کہ تو ہے دیوانہ
نکلا بے اختیار دُردانہ

لڑکھڑائی جو یوں زباں چل کر
ہنس پڑے سب وہ رہ گیا ششدر

راز افشا ہوا جو یوں اک بار
دل میں کٹ کٹ گیا وہ غیرت دار

بات کی تہہ جو تھی وہ آ گئی ہات
پوچھنے کو نہ رہ گئی کوئی بات

دیکھ کر جو بھی مسکراتا تھا
یہ پسینے میں ڈوبا جاتا تھا

اتنا آخر دبی زباں سے کہا
مجھ کو جو چاہو کہہ لو سب ہے بجا

ہے شرافت کی شان یہ بھائی
کہ نہ ہو دوسرے کی رسوائی

دوست ناصر کا ایک تھا صادق
سب سے اخلاص و خلق میں فائق

دوست کو پا کے تیر غم کا شکار
دل لگی چھوڑ دی بن گیا غم خوار

چھیڑ سے اور سب کو بھی روکا
پھر یہ سنجیدگی کے ساتھ کہا

کہ اگر دوستی کا ہے دعویٰ
تو کرو دوستی کا حق بھی ادا

دشمنی ہو گی دوستی ایسی
کہ اڑائیں ہم اس کے غم کی ہنسی

دیکھیں ہنس ہنس کے حال گھائل کا
کیا تماشا ہے رقص بسمل کا

چل کے نواب نامور سے ملیں
اور شادی کا دیں پیام انھیں

مان لیں وہ جو بات ہو معقول
اور اس پر بھی گر کریں نہ قبول

تو ہے پھر شرط دوستی کی یہی
کہ نہ ہونے دیں اور سے شادی

سن کے یہ بات جتنے تھے غم خوار
بہر امداد ہو گئے تیار

ہوئے نواب کے جو ہوش بجا
دل تلا طسم کے بعد کچھ ٹھہرا

تو تقاضا ہوا یہ بیگم کا
کہ بلاؤ اس آدمی کو ذرا

میں بھی دیکھوں بشر وہ کیسا ہے
کوئی انساں ہے یا فرشتا ہے

رکھے اللہ اسے بھی شاد آباد
ہاتھ سے جس کے پائی دل کی مراد

بولے نواب ہاں بلاؤں گا
پاس اپنے اسے بٹھاؤں گا

تاکہ وہ بھی ہو اپنی جا خرسند
اور رتبہ ہو ہر نظر میں بلند

تھا جو دل مائل اولوالعزمی
کشتیاں سج دیں خلعت و زر کی

خاص لوگوں کو پہلے جمع کیا
اور ناصر کو گھر سے بلوایا

اس نے آنے سے کر دیا انکار
حیلہ یہ تھا کہ ہوں بہت بیمار

ورنہ خود آتا حال پُرسی کو
کیا کروں اپنی کم نصیبی کو

سُن کے نوّاب نے کہا بہتر
وہیں لے جاؤ سب یہ خلعت و زر

میری جانب سے اس کو دے کے دُعا
کہنا انعام ہے یہ خدمت کا

پہنچا ناصر کو جس گھڑی یہ پیام
اور ہوا پیش خلعت و انعام

پاس تھے جمع یار دوست سبھی
آ گئے تھے محلّے والے بھی

ہو کے لطف و کرم پہ شکر گزار
کیا ناصر نے لینے سے انکار

پہلے انعام نوکروں کو دیا
لکھ کے پھر ایک خط حوالے کیا

لوگ حیراں یہ کیا کیا اُس نے
رد عطیہ کو کر دیا اُس نے

مگر ایسے بھی کچھ تھے دانش مند
جن کو آئی یہ آن بان پسند

پہنچیں واپس جو کشتیاں ساری
ہوئی حیرت نواب پر طاری

پوچھنے پر جواب کیا ملتا
خادموں نے لفافہ پیش کیا

خط جو نوّاب نام در نے پڑھا
تو یہ تھا صاف صاف لکھا ہوا

اے سحابِ کرم محیط سخا
اللہ اللہ یہ شانِ مہر و عطا

کہ اندھیرے میں روشنی ہو جائے
ایک بے مایہ بھی غنی ہو جائے

ایسی ہی فیض باریوں سے مگر
لہلہاتے ہیں سبز ہو کے شجر

رویاں رویاں بنے زبان مرا
حق نہ ہو شکریہ کا پھر بھی ادا

سَر پہ آنکھوں پہ یہ عنایت ہے
مجھ کو لیکن نہیں ضرورت ہے

اتنا ہے فضل خالقِ اکبر
عمر ہوتی ہے آبرو سے بسر

اہلِ حاجت پہ ہو اگر یہ عطا
تو غریبوں کے منہ سے نکلے دُعا

پڑھ کے یہ سَرد پڑ گئے تیور
ہاتھ سے خط گرا ہوئی نہ خبر

کہا کیا بد نصیب ہے یہ بھی
پھیر دی جس نے دولت آئی ہوئی

ہوئی بیگم کو جس گھڑی یہ خبر
کہ پلٹ آیا جا کے خلعت و زر

دل میں سمجھیں کہ ہے کوئی خوددار
کہ جو احسان کا نہ اُٹھا بار

اپنی جا ہو رہیں خموش مگر
بڑھ گیا اور دل پہ تھا جو اثر

ہے زمانہ تو جانے ہی کے لیے
اور نیا وقت آنے ہی کے لیے

ہے گھڑی کوئی بد کوئی ہے سعد
دن ہے آنا ضرور رات کے بعد

کٹ رہے تھے اسی طرح ایام
شام سے صبح اور صبح سے شام

تازہ تھا جشن کا عروج و زوال
عہد ماضی کا آئینہ تھا حال

جس نے اس حادثہ کو دُہرایا
نام ناصر کا بھی ضرور آیا

چونک پڑتی تھی سُن کے دُردانہ
واقعہ بن سکا نہ افسانہ

تازہ ہو جاتا تھا جگر کا داغ
بھڑک اٹھتا تھا جھلملاتا چراغ

لاکھ اُبھرتا تھا شوق کا جذبہ
قفل ہونٹوں پہ تھا خموشی کا

اک کنواری کہے زبان سے کیا
دل ہی کہتا تھا دل ہی سنتا تھا

بولتی کچھ یہ اس کی شان نہ تھی
کان تو تھے مگر زبان نہ تھی

ضبط غم سے عجیب حالت تھی
بہکی بہکی سی کچھ طبیعت تھی

اکثر ایسا بھی حال پیش آیا
بات کچھ کی جواب کچھ پایا

ماں تو صورت ہی دیکھا کرتی تھیں
دیکھ کر چال ڈھال بھانپ گئیں

کہ یہ بھولی نہیں بُرے دن کو
یاد کرتی ہے اپنے محسن کو

ہے خدا رکھے اب جوان جہان
دل میں کر لیتا ہے جگہ احسان

اور بدل جاتا ہے محبت سے
وہ محبت عیاں ہے صورت عیاں

ایک شب کو قریب بستر خواب
پاس بیگم کے بیٹھے تھے نواب

ذکر دُردانہ کا جو کچھ آیا
تو یہ بیگم نے مسکرا کے کہا

ہو چکی ہے سیانی اب لڑکی
شادی اک روز کرنا ہی ہوگی

ہوتی ہے ایسی سخت بر کی تلاش
تھک کے رہ جاتی ہے نظر کی تلاش

پہلے سیرت ہے بعد صورت ہے
اور اس سب کے بعد قسمت ہے

غیب کا حال کوئی کیا جانے
نہ بنے یا بنے خدا جانے

کر دیں ناصر ہی سے نہ کیوں شادی
کیا بُری ہے یہ خانہ دامادی

آزمائش میں پورا اُترا ہے
اور پھر اک غریب لڑکا ہے

ہر طرح کا دباؤ مانے گا
ناز اُٹھائے گا قدر جانے گا

کرتے کیوں کر پسند یہ نسبت
کیوں کہ نواب تھے فلک رفعت

تیوریاں بدلیں اور بگڑ کے کہا
مُنہ سے کیوں کر تمہارے یہ نکلا

ہے کوئی شے وقار بھی گھر کا
یہ تو رشتہ نہیں برابر کا

کس کو ہو گی بھلا یہ بات پسند
شال میں دے دیں ٹاٹ کا پیوند

ہم کو کرنا نہیں ہے بَر کی تلاش
بے تھکے دیکھ لی نظر کی تلاش

کم نہیں جو کسی سے شان میں ہے
اور اپنے ہی خاندان میں ہے

مرد کی صورت اور سیرت کیا
پلّہ دولت میں ہے برابر کا

شان بالا ہے نام صولت ہے
نام ہی سے نمود سطوت ہے

کہا بیگم نے واہ کیا کہنا
جمع ہیں عزّ و جاہ کیا کہنا

علم کا کس قدر خزانہ ہے
بولے روٹی نہیں کمانا ہے

صاحب علم و صاحب صمصام
زر اگر پاس ہے تو سب ہیں غلام

بولیں بیگم کہ خوب یاد آیا
ہاں وہی صولتِ گراں مایا

جو بڑے کر و فر سے آیا تھا
پاس زانو دبا کے بیٹھا تھا

پہلا ہی لو کا آگ کا جو اُٹھا
یوں وہ بھاگا کہ پھر پتہ نہ لگا

تھا ابھی تو قدیم ہی رشتا
کیا کیا حق بہن کا اس نے ادا

ڈالی قسمت نے گر کبھی سختی
کیا حفاظت کرے گا بیوی کی

خاک مردانگی دکھائے گا
پیچھے عورت کے چھپنے آئے گا

ہو تمہاری نظر میں وہ فائق
میری دُردانہ کے نہیں لائق

ہے مزاجوں میں فرق شام و سحر
جلتی بھٹی میں جھونک دوں کیوں کر

آگے بڑھ کر جو دونوں میں نہ بنی
ہو گی مٹی خراب لڑکی کی

ہم کو تو صرف بیاہ کرنا ہے
اور اُسے تو نباہ کرنا ہے

سچ جو پوچھو تو حق اُسی کا ہے
موت کے مُنہ سے جس نے چھینا ہے

جَل چکا تھا ہمارا سرمایا
آگ میں گھس کے وہ بچا لایا

آج ہے ذکر جس کی شادی کا
قصّہ بن جاتی نامرادی کا

بن پڑا جب نہ کوئی اس کا جواب
چال اُس وقت یہ چلے نوّاب
رکھو اب فیصلہ یہ لڑکی پر
کہہ دو خود سوچے اپنا نفع ضرر
ایک صولت ہے ایک ہے ناصر
بیاہ دونوں میں کس سے ہو آخر
خود وہ اپنی پسند بتلا دے
کہ نہ الزام کل کو دنیا دے

دُردانہ کے ساتھ نوجوان ہمجولیوں کی چھیڑ چھاڑ!

بات ہمجولیوں نے جب یہ سُنی
نئی دل چسپی ان کے ہاتھ لگی
ایک دُردانہ کو بنانے لگیں
ہر طرح چھیڑنے ستانے لگیں
نام ناصر کا اس نے ہنس کے لیا
اور وہ منھ تاکنے لگی اُس کا
ایک کچھ کہہ کے گدگداتی تھی
دوسری قہقہہ لگاتی تھی
ایک کہتی تھی وہ تو مرتا ہے
دم محبّت کا ان کی بھرتا ہے
اک بہت مُنہ لگی تھی اور چنچل
دو گھڑی بیٹھتی نہ تھی کسی کل
بولی وہ ان کو کیا نہیں الفت
دل کی حالت بتاتی ہے صورت
نام لیتا ہے اس کا جب کوئی
منہ پہ آجاتی ہے بحالی سی
اور دُردانہ بُت بنی ہوئی تھی
ایک چُپ میں ہر اک بلا ٹالی
آخر اک بولی کہتی کیا ہو بُوا
وہ تو پہلے سے اُن پہ مرتا تھا
اور ہو سکتا یہ بھلا کس سے
جان پر کھیلے آگ میں پھاندے
تن پہ لی اپنے آگ کی گرمی
آنچ اُن پر مگر نہ آنے دی
ایک بولی کہ جب نہ شرم آئی
جب گلے سے تھیں اس کے چمٹی ہوئی
منہ پہ اس نے رکھ دیا ہوگا
پیار چُپکے سے کر لیا ہوگا
سُنتی ہوں رہتا ہے اُداس اُداس
بھرتا ہے نام سُن کے ٹھنڈی سانس
تم کو بھی اس کی چاہ ہے کہ نہیں
دل سے کچھ دل کو راہ ہے کہ نہیں
کیا کیا ایسے باوفا کے لیے
منہ سے کچھ تو کہو خدا کے لیے
اور کیا دیں تمھیں کسی کی قسم
بولو بولو تمھیں اُسی کی قسم

جب بہت لڑکیوں نے تنگ کیا
ہوگا بھی، کہہ کے مُنہ کو پھیر لیا

پاس آئی سَرک کے اک لڑکی
تھی جو نوّاب کی پڑھائی ہوئی

بولی کیوں چھیڑتی چڑھاتی ہو
دُکھ میں دُکھ کس لیے بڑھاتی ہو

کیا کہیں مُنہ سے اور بولیں کیا
جوڑ ہی جب نہیں برابر کا

وہ تو ہے اک غریب اور یہ امیر
کیا سمجھتی نہ ہوں گی دل میں حقیر

لائق ان کے جو ہے تو صولت ہے
جس کے قدموں کے نیچے دولت ہے

یہ بھی آخر نواب زادی ہیں
عیش کی بچپنے سے عادی ہیں

اک غریب ان کو چین کیا دے گا
دُکھ اٹھائیں یہ کون چاہے گا

کہہ دیا ہے نواب صاحب نے
ہو گی شادی اگر تو صولت سے

بس یہ سنتے ہی ضبط ہو نہ سکا
مارے غصّے کے چہرہ سُرخ ہوا

اک طرف جوش پاس عزّت کا
اک طرف خوف خونِ عصمت کا

وہ نہیں آخر حیا کا چھوٹ گیا
اور خموشی کا قفل ٹوٹ گیا

بولی بس چُپ رہو نہ بھیجا کھاؤ
لو جواب اور میرے پاس سے جاؤ

تم سے پوچھیں اگر حضور ابّا
تو یہ میری طرف سے کہہ دینا

کہ رہے سَر پہ آپ کا سایا
سب سے بڑھ کر ہے باپ کا سایا

اَب مناسب نہیں مری شادی
ہو چکی حسرتوں کی بربادی

چھو چکا مجھ کو غیر مرد کا ہاتھ
شادی اب کیجیے گا کس کے ساتھ

ایسی عورت زمیں میں گڑ جائے
دوسرا آ کے جس کو ہاتھ لگائے

کہتی جاتی تھی روتی جاتی تھی
غم کی تصویر ہوتی جاتی تھی

سُن کے یہ لڑکیوں کے اڑ گئے ہوش
اٹھیں انگلی دبائے منہ میں خموش

پڑ رہی مُنہ لپیٹ کر وہ بھی
روئی تا صبح لیٹ کر وہ بھی

اندر اندر جو غم گھلانے لگا
تو بس آخر بخار آنے لگا

دوست ناصر کے ایک دن سرِ شام
ہوئے نوّاب پاس جمع تمام

وجہ پوچھی گئی جو آنے کی
تو بصد عاجزی یہ بات کہی

کہ غرض ایک لے کے آئے ہیں
ہو اجازت اگر تو عرض کریں

بولے ہاں ہاں کہو ضرور کہو
دل سے تیار ہوں میں سننے کو

صادق اپنے مقام سے اٹھا
ایک مکتوب آگے رکھ کے کہا

شرم مانع ادب ہے دامن گیر
دل کا مطلب اسی میں ہے تحریر

وہ نوشتہ نواب نے جو پڑھا
چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا

قہر پنہاں تھا بگڑے تیور میں
اُٹھ کے چپکے چلے گئے گھر میں

دیکھا بیٹھی ہیں سوچ میں بیگم
لڑکیاں بھی ہیں سر کئے ہوئے خم

پہلے بیگم اٹھیں پئے تعظیم
جھک کے پھر لڑکیوں نے کی تسلیم

بیٹھتے ہی نواب نے پوچھا
دل کا لڑکی کے کچھ کھلا منشا

اپنی مرضی بیان کی کہ نہیں
ماں نے بیٹی کی باتیں دہرائیں

مکرر وہی جو دردانہ نے کہا تھا

کہ رہے سر پہ آپ کا سایہ
حق کی رحمت ہے باپ کا سایہ

اب مناسب نہیں مری شادی
ہو چکی حسرتوں کی بربادی

چھو چکا مجھ کو غیر مرد کا ہاتھ
شادی اب کیجیے گا کس کے ساتھ

ایسی عورت زمیں میں گڑ جائے
دوسرا آ کے جس کو ہاتھ لگائے

سنتے ہی حال غم رسیدہ کا
چھا گیا دل پہ ایک سناٹا

پوچھا بیگم نے ہاتھ میں ہے یہ کیا
کہا آیا ہے رقعہ شادی کا

مل کے ناصر کے دوست آئے ہیں
اور وہی رقعہ بھی یہ لائے ہیں

پوچھا پھر کیا جواب اُن کو دیا
کہا اس کا جواب ہی ہے کیا

شان سے جب وہ آ نہیں سکتا
گت کی اک نتھ بھی لا نہیں سکتا

اور کوئی سرپرست تک نہیں ساتھ
کس ضمانت پہ دیں گے ہاتھ میں ہاتھ

جو یہاں سے جہیز جائے گا
وہ بھی گھر میں کہاں سمائے گا

لڑکی اتنے بڑے محل کی پلی
چھوٹے سے گھر میں کیسی اُلجھے گی

نہیں کرتی ابھی تو کوئی کلام
منہ کے کھلتے ہی دے گی سو الزام

کہ میں راضی ہی کب تھی شادی پر
کیوں ڈھکیلا مجھے غریب کے گھر

بولیں بیگم کہ ہے یہ بات خلاف
لڑکی ایسی نہیں قصور معاف

بات سے اپنی ہو گی منکر کیا
وہ اُسی کی ہے جس کا ہاتھ لگا

دوسرے سے ضرور ہے انکار
کہ ہے باعصمت اور غیرت دار

دُکھ بھی قسمت سے گر اٹھائے گی
کبھی شکوہ نہ منہ پہ لائے گی

اس کو آرام کی کمی کیا ہے
نہیں سسرال اگر تو میکا ہے

ہو گا درکار کیسا ہی سامان
جو نہ ہو گا وہاں ملے گا یہاں

جب وہ خود ہے امیر کی بیٹی
دُکھ اٹھانے لگی بلا اُس کی

ہم تو ہیں اور اگر نہیں کوئی
ہر طرح خود کریں گے دل جوئی

اور بیٹی کوئی نہ بیٹا ہے
جو ہمارا ہے سب اُسی کا ہے

ہر طرح جب کیے گئے قائل
تو یہ نواب بولے ہو کے خجل

خیر بہتر تمھاری جو مرضی
تم ہو اب ذمہ دار یا لڑکی

کہہ کے یہ خادمہ سے منگوایا
ایک صندوقچہ جواہر کا

کھولا اور ہر طرف نظر ڈالی
ایک جوڑی نکالی موتی کی

یوں ہی باہر لیے چلے آئے
رکھ دیا آگے لا کے صادق کے

اور کہا جو ہے رسم دنیا کی
کم سے کم وہ تو کرنا ہی ہو گی

ڈالوں بوجھ اور اُس غریب پہ کیا
نتھ چڑھاوے کی بس اور اک چھلا

یہ بھی بوجھ آدھا کر دیا میں نے
ایک موتی تو لا دیا میں نے

دوسرا وہ کہیں سے لے آئے
ایسا ہی ہو کہ جوڑی بن جائے

اک مہینہ کی دیتا ہوں مہلت
کوشش اس کی ہے آگے اور قسمت

ہاں رسید اس کی مجھ کو دیتے جاؤ
میری تحریر مجھ سے لیتے جاؤ

لے کے صادق نے موتی بے تاخیر
دی بھی تحریر لے بھی لی تحریر

دل کو بیگم کے بھی لگی ہوئی تھی
پاس پردے کے سُن رہی تھیں کھڑی

آئیں جلدی سے پھر کے اپنی جا
اور زیور نکال کر دیکھا

ویسا ہی ان کی تھیں تھا موتی
بھیجا ناصر کو دوسرا موتی
کہ پریشان ہو نہ گھبرائے
یہی موتی لیے چلا آئے
میں ہوں راضی تو ڈر اُسے کیا ہے
نہ ہو شادی تو میرا ذمّا ہے

جب سے احباب خاص ناصر کے
بن کے پیغامبر گئے ہوئے تھے
کبھی چہرہ تھا سُرخ گاہ سپید
ناامیدی سوا تھی کم امید
جزر و مد دل میں رنج و راحت کا
فیصلہ ڈھونڈھتا تھا قسمت کا
فرش تھیں تا حدِ نگاہ آنکھیں
محو تھیں دیکھنے میں راہ آنکھیں
دیکھا ناگاہ آ رہے ہیں وہ سب
صادق ان سب کے آگے خندہ لب
یہ سراپا امید بن کے بڑھا
تو دیا سب نے جاں فزا مژدا
پیش صادق نے کر دیا موتی
تھا جو شادی کی شرط کا موتی
شرط و میعاد شرط سُنتے ہی
تازہ امید یاس سے بدلی
دل میں سوچا کہ ہے یہ جنس گراں
جوڑی اُس کی مجھے ملے گی کہاں
اور صرف ایک مہینہ کی مہلت
جب ہے ممکن کہ ساتھ دے قسمت
شکریہ دوستوں کا کر کے ادا
تکیہ قسمت پہ کر کے اُس نے کہا
اتنی تکلیف آپ اور اُٹھائیں
کہ ابھی لے کے اِس کو واپس جائیں
ہے امانت پرائی اور جو کم
موتی اُن کا نہ پاس رکھیں گے ہم
کہنا ہے شرط آپ کی منظور
کیوں بٹائیں ہمارا بوجھ حضور
جو غریب ایک پائے گا موتی
دو بھی وہ ڈھونڈ لائے گا موتی
ہے مقدر میں گر تو لاؤں گا
ورنہ صورت نہیں دکھاؤں گا
لے کے صادق جواب اِدھر سے چلا
اُدھر آیا پیام بیگم کا
لے لو بھیجا ہوا مرا موتی
پہلے موتی کی جوڑ کا موتی
نہ کرو شرط پوری کرنے میں دیر
پھر نہ تقدیر ڈال دے کوئی پھیر
زندگی پھر سے جس کو بخشی ہے
اب وہ میری نہیں تمہاری ہے
میں ہوں جھک سے نواب کی مجبور
ورنہ مجھ کو تو دل سے ہے منظور

شفقت آمیز تھا جو سارا کلام
خوش ہوا ناصر اور دیا یہ پیام

یہ کرم اک حقیر خادم پر
دل کا ممنون اس کا میں ہوں مگر

اب یہ موتی کروں گا لے کر کیا
پہلا موتی تو میں نے پھیر دیا

پھر یہ طرزِ عمل قصور معاف
ہے سراسر معاملے کے خلاف

لے کے اونچی دُکان سے سودا
کر کے قیمت بھی غلّے ہی سے ادا

گر دعائیں حضور کی ہیں ساتھ
موتی لے آئیں گے یہ خالی ہاتھ

اب بھروسہ اسی پہ ہے میرا
جو ہے شفقت میں باپ ماں سے سوا

آئی تھی موتی لے کے جو عورت
ہوئی پا کر جواب وہ رخصت

ناصر اندر مکان کے آیا
رقعہ اک دوستوں کے نام لکھا

دیا چھوچھو کو اپنی اور یہ کہا
صادق آئے تو اُس کو دے دینا

کیا سامان پھر سفر کا درست
باندھ لی ہمّت اور کمر کی چست

تھا پتہ راہ کا نہ منزل کا
کر کے تکیہ خدا پہ چل نکلا

کون سمجھے کرشمے قسمت کے
موتی آئے بھی اور پلٹ بھی گئے

بندھتا دونوں میں کس طرح رشتا
تھا عنایت میں فرق نیّت کا

اک نمونہ غرور و نخوت کا
ایک سرمایہ لطف و شفقت کا

اس کا مطلب کہ ڈال دے مشکل
اس کا مقصد کہ حل کرے مشکل

گو بظاہر تھا کوئی کم نہ سوا
پھر بھی تھا فرق سچّے جھوٹے کا

منسلک ایک میں وہ ہوتے کیا
جب کہ دونوں میں قطع تھا رشتا

ہوا سچّا ہی فیصلہ آخر
مرحبا پاک نیت ناصر

پہلے موتی نواب کو پہنچا
ہے وہی یا نہیں یہ شک گزرا

جانچی جلدی سے تول ناپ اس کی
پرکھی پھر آب و تاب آپ اُس کی

دی رسید اور رکھ لیا موتی
جیسے کھویا ہوا ملا موتی

موتی واپس ہوا جو بیگم کا
اور پیغام معذرت بھی ملا

دل میں سوچیں کہ ہے بڑا ہی غیور
کہ مدد ایک بھی نہ کی منظور

خیر جس پر اُسے بھروسا ہے
وہی امداد کرنے والا ہے

پھر بھی کچھ ذہن میں نہیں آتا
کہ وہ موتی کہاں سے پائے گا

دینے والے کے تو ہیں ہاتھ ہزار
لے گا کیوں کر وہ جس کو ہے انکار

بے دلائے وہ کس طرح دے گا
اور یہ لے گا تو کس طرح لے گا

اسی اُلجھن میں تھیں ابھی بیگم
پہنچے نواب سر کئے ہوئے خم

نہ وہ بولے نہ کچھ انھوں نے کہا
بھید لب تک نہ آسکا جی کا

فرق رنج و خوشی نہیں چھپتا
چہرہ دونوں کا چغلی کھاتا تھا

گئے واپس نواب خوش اوقات
ٹل گیا وقت اور رہ گئی بات

گھر میں ہونے لگا مگر چرچا
ایک نے سُن کے دوسرے سے کہا

اڑتی اڑتی نواب تک بھی گئی
دوسری واردات موتی کی

بولے غصّے میں آگے بیگم سے
تم نے ناصر کو موتی بھیجے تھے

بولیں ہاں ایک موتی بھیجا تھا
کہ توازن نہ بگڑے جوڑی کا

پھیر اجب اُس نے آپ کا موتی
لے کے کیا کرتا دوسرا موتی

سچ تو یہ ہے مجھی سے چوک ہوئی
جوڑی کیوں موتیوں کی بھیج نہ دی

جب نہ رہتا تلاش کا حیلا
عذر کچھ بھی نہ اس سے بن پڑتا

بولے نواب ہے نہ بدبختی
بے زری اور اُس پہ ہیں اِتنی

آپ بھی جب ہے مفلس و نادار
دوسرے سے بھی لینے میں انکار

ہوگی شادی تو کس طرح ہوگی
دے نہ دو ناٹے باندھ کے لڑکی

غیر کی کر رہی ہے ہو بچ اتنی
جیسے ہوتی ہے ممتا ماں کی

بولیں بیگم پھر اس میں شک کیا ہے
بیٹی دے کر بھی بیٹا ملتا ہے

اب تو دُرّ دانہ کم ہے اور وہ سوا
کہ ہے احسان ہی بدلا احساں کا

کوکھ تو کب کی جل چکی ہوتی
آج اسی سے ہے ممتا ٹھنڈی

بولے وہ ایک قول ایک زباں
بولیں بیگم یہی یہی، ہاں ہاں

اُٹھ کے باہر چلے گئے نواب
رہ گئیں یہ بھی کھا کے پیچ و تاب

آئے پھر کر جو دوست ناصر کے
گھر پہ خط پایا دوست کے بدلے

کھولا صادق نے اور اس کو پڑھا
تو یہ بعدِ سلام لکھا تھا

دل پہ لے کر غمِ جدائی کو
جاتا ہوں قسمت آزمائی کو

میں تمھارا، یہ گھر تمھارا ہے
آگے اللہ کا سہارا ہے

وہی لائے گا اب تو آؤں گا
ورنہ صورت نہیں دکھاؤں گا

حسرت آگیں پیام جب یہ پڑھا
تو قلق دوستوں کا اور بڑھا

رہے پہلے تو دیر تک مبہوت
آنکھیں پُر نم تھیں اور لب پہ سکوت

پھر جو اک بار دل میں جوش اٹھا
تو یہ صادق نے اور سب سے کہا

کہ پتہ جب نہیں تو جائیں کہاں
ڈھونڈھنے جائیں بھی تو پائیں کہاں

اب ہمارا ہے فرض اتنا ہی
کہ ہے میعاد شرط میں جتنی

اتنے دن انتظارِ دوست کریں
بیاہ در دانہ کا نہ ہونے دیں

صولت ان کا ہے اک عزیز قریب
ڈر ہے ناصر کا بن نہ جائے رقیب

دل میں لالچ نواب کے زر کا
اور پلّہ یہ ہے برابر کا

طینت اچھی نہیں نواب کی ہے
اور نظر اس پہ انتخاب کی ہے

چل کے اب دیکھنا ہے یہ بھی ذرا
ہے پسِ پردہ ہائے زرّیں کیا

صولت اک بے شعور لڑکا تھا
ناز و نعمت کی گودیوں کا پلا

نہ تو صورت تھی اور نہ سیرت تھی
پردہ دارِ عیوب دولت تھی

عقل سے دور، علم سے خالی
اس پہ بھی مرتبہ بہت عالی

اس کو یہ بھی خبر نہ تھی اصلا
آنا کتنا ہے خرچ ہوتا ہے کیا

اور جو مال و منال پایا ہے
کون سے سلسلہ سے آیا ہے

فخر کی بات یاد تھی اتنی
ہے مرا خاندان نوابی

دوست اس کے تھے ایسے کچھ اوباش
کہ جرائم تھی جن کی وجہ معاش

کوئی لڑکا امیر کا بگڑا
کر لی جھٹ اس سے دوستی پیدا

پینگ فوراً بڑھا لیے اتنے
کہ نہ دیکھے تو چین ہی نہ پڑے

رہتے تھے ٹھاٹھ باٹ سے تو سبھی
اور جھنجی کسی کے پاس نہ تھی

ایک کو جب بنا چکے قلّاش
کر لیا دوسرا شکار تلاش

جو تھا وہ اپنے فن میں کامل تھا
اور پورا جتھا وہ یک دل تھا

دوست صولت کے جتنے تھے خوددار
خود الگ ہو گئے وہ آخر کار

نہ رہا کوئی ٹوکنے والا
صحبتِ بد سے روکنے والا

اب تباہی کا تھا یہ چور رستا
ریس، رنڈی، شراب اور سٹّا

یہ اندھا دھند خرچ صبح و مسا
کر دے خالی خزانہ قاروں کا

کیا حقیقت تھی اتنی دولت کی
جو وراثت میں ہاتھ آئی تھی

کل تھے جن میں بھرے ہوئے توڑے
آج صندوق بھی وہ بکنے لگے

بگڑی حالت مگر نہ بدلے چلن
گھر ہوا رہن بک گئی پنشن

جوہری چک تھے اب وہ دوست کہاں
جل گیا کھیت اُڑ گئیں چڑیاں

اُجڑا جنگل بنا تھا زیست کا باغ
رات باقی تھی اور گل تھا چراغ

پہلے جھک جھک کے کرتے تھے جو سلام
اب نہ اُن سے سلام ہے نہ کلام

در پے آنے میں جن کے عزت تھی
گھر بلاتے انھیں کراہت تھی

فاقے ہونے لگے تو ہوش آیا
خواب سے ٹھوکروں نے چونکایا

قرض کس آسرے پہ اب ملتا
گھر بھی نیلام پر چڑھا ہوا تھا

صحبتِ بد سے اور کیا پاتا
لُٹ چکا جب تو لوٹنا سوجھا

سوچا دُرد آنہ گر مری ہو جائے
تو گئی دولت الٹے پاؤں پھر آئے

ناصر اس طرح گھر سے نکلا تھا
کہ نہ تھا ہم سفر نہ راہ نما

بے سہارے تھی جستجو دل کی
تھی نہ منزل نہ راہ منزل کی

قول کی شرم اور بات کی کد
اپنی ہمّت تھی اور خدا کی مدد

موتیوں کی تلاش دل بے چین
یہی شے لائی اس کو تا بحرین

کیا آتے ہی اک سرا میں قیام
دل تھا بے چین لیتا کیا آرام

صبح کے ہوتے ہی وہ اُٹھ بیٹھا
اور لیا راستہ سمندر کا

جتنا نزدیک آتا جاتا تھا — دل سہارا سا پاتا جاتا تھا
پہنچا جس وقت اپنی منزل پر — موجیں لینے کو دوڑیں ساحل پر
ہوا تیار اُتار کے کپڑے — اپنی قسمت کے فیصلے کے لیے
پھر یہ کی ہاتھ اٹھا کے حق سے دُعا — کہ ہے بس تو ہی دادرس سب
جس نے مانگا کسی سے تیرے سوا — بیچ دی اس نے آبرو گویا
نہیں دل کو قبول اے یزداں — غیر کے ہاتھ سے ترا احساں
ہے تری دی ہوئی یہ عزت بھی — تو ہی رکھے گا اس کی غیرت بھی
لب پہ حاجت یقین دل میں تھا — بند کیں آنکھیں اور پھاند پڑا
بولی خوش قسمتی کہ میں ہوں ساتھ — مارے تہہ پر اِدھر اُدھر کئی ہاتھ
اب جو اُبھرا تو سیپ ہاتھ میں تھی — جیسے مل جائے داد محنت کی
جس میں سرمایہ دید کا وہ سیپ — جو خزانہ امید کا وہ سیپ
جس میں موتی بھرے تھے حسرت کے — جس میں چمکیلے تارے قسمت کے
حُسن کی جنس کا جو بیعانہ — حسرتوں کا چراغ کاشانہ
جس کو کہیے عطیۂ معبود — جس میں دولت خوشی کی لامحدود
سوئے ساحل چلا وہ یوں دل شاد — ہاتھ آجائے جیسے دل کی مُراد

آرہا تھا کہیں سے اک بجرا — کسی با اقتدار تاجر کا
سیر سے سیر ہو چکا تھا جو دل — رُخ تھا بجرے کا جانبِ ساحل
تھی سوار اُس پہ زوجۂ تاجر — سب کنیز و غلام تھے حاضر
تھا شباب اُس کا گو کہ ڈوبتا چاند — اُس پہ چاند اُس کے حُسن سے ماند
یوں تھے پژمردہ پھول سے رخسار — جیسے گلشن کی آخری ہو بہار
اس کو ساری بہارِ عشرت سے — ایک ہی پھل ملا تھا قسمت سے
اک کنارے پہ شان سے تھی کھڑی — عمر بھر کی کمائی گود میں تھی
زیبِ آغوش چاند سا بچہ — دل کی تسکین آنکھ کا تارا
بچہ پانی کی سمت تکتا تھا — لہر جب اُٹھتی تھی ہمکتا تھا

دفعتاً ہاتھ سے وہ یوں چھوٹا
پھول جیسے کہ ڈال سے ٹوٹا

ماں پکاری ارے مرا موتی
دوڑو دوڑو کہ گر گیا موتی

جو بچائے گا اس کی لال سی جان
جو بھی مانگے گا دوں گی میں اس آن

جتنے عرصہ میں منہ سے یہ نکلا
بہت آگے نکل گیا بجرا

پھڑ پھڑاتی تھی ماں تا ماں کی
خود بھی پانی میں پھاندی پڑتی تھی

عورتیں روکتیں لپٹ کے نہ گر
ڈوب جاتی وہ آپ بھی گر کر

یہی قسمت سے وقت اس کا تھا
جب لیے سیپ ناصر اُبھرا تھا

موتی موتی کا اُس نے غل جو سُنا
اور بچے کو ڈوبتے دیکھا

کامیابی کی تھی خوشی جتنی
بن گئی دوسرے کی ہمدردی

موج کی طرح زور میں پلٹا
مارے دو ہاتھ اور جا پہنچا

اب یہی تھا مُراد کا موتی
پھینک دی سیپ اٹھا لیا موتی

رُک گئے ہاتھ جب تو کرتا کیا
وہیں جم کر کھڑی لگانے لگا

ڈوبنے سے بچا اِدھر بچّا
آ لگا گھاٹ پر اُدھر بجرا

دوڑی خاتون اُتر کے برہنہ سر
گر گئی اضطراب میں چادر

فرق تھا خون کی روانی میں
تن تھا خشکی میں جان پانی میں

پہلی ہی چیخ سُن کے ساحل سے
کشتیاں لے کے لوگ دوڑے تھے

ایک ملّاح نے جوں ہی دیکھا
گود میں اک جواں کی ہے بچّا

جلد کشتی بڑھا کے پاس آیا
دلِ ناصر نے آسرا پایا

تھا بہت مضطرب دلِ رنجور
طاق طاقت تھی اور ساحل دور

پا کے فضلِ خدا کو کشتی پر
آ گیا نوجوان کشتی پر

لوگ ساحل کے غل مچانے لگے
ہو کے خوش تالیاں بجانے لگے

ٹکٹکی ماں نے اس طرح باندھی
بن گئی کشتی آنکھ کی پُتلی

کچھ ادھر ماجھیوں کی تھی کاوش
کچھ معاون ادھر تھی دل کی کشش

گھاٹ پر کشتی آ لگی آخر
اُترا معصوم کو لیے ناصر

بچّہ اس طرح کچھ تھا چمٹا ہوا
جیسے اک جزو تن اسی کا تھا

لینا چاہا جو ماں نے لال اپنا
ڈر کے چلایا زور سے چمٹا

لاکھوں خاتون نے دعائیں دیں
ساتھ ہی دونوں کی بلائیں لیں

اور کہا اب ہیں دونوں میرے پسر
ایک کھویا تھا پائے دو گوہر

منہ دکھا کر جب اس کو چمکارا
تو گیا ماں کی گود میں بچّا

ساتھ دونوں کو لے کے گھر پلٹی
بے دل آئی تھی خوش مگر پلٹی

قصّہ تاجر نے جس گھڑی یہ سُنا
وہ بھی ناصر کا ہو گیا شیدا

تھا جو احسان مند گھر سارا
جو تھا آنکھیں بچھائے دیتا تھا

مگر اس کو تو اور لَو تھی لگی
گتھی سلجھی نہ تھی مقدر کی

اک مہینے کی تھی فقط مہلت
تھی نگاہوں میں وقت کی قیمت

آخر اک روز باندھ کر ہمّت
کہا اب کیجئے مجھے رخصت

گھر سے جس کے لیے میں نکلا تھا
کام وہ بھی تو کرنا ہے پورا

ہوئی خاتون رو کنے پہ مُصر
تو یہ بولا جھکا کے سَر ناصر

مِل گیا گر کے آپ کا موتی
میرا ہاتھ آگے گر گیا موتی

پھر اُسے ڈھونڈھ کر میں لاؤں گا
نہ بغیر اس کے گھر کو جاؤں گا

چڑھے پروان آپ کا بچّا
میرے حق میں بھی کیجئے گا دُعا

دانت ہنسنے میں گو نکل آئے
مگر آنکھوں سے اشک ڈھل آئے

دفعتاً یاس میں امید کا جوش
گرا چکرا کے ہو گیا بے ہوش

دیکھ کر اس کی اشک افشانی
دل تھا عورت کا ہو گیا پانی

یاد احسان کی جوش میں لائی
پھر سے چونکا کے ہوش میں لائی

پوچھا در کار کیسے موتی ہیں
میں ابھی دوں گی جیسے موتی ہیں

میرا بیوپار موتیوں کا ہے
موتیوں کی یہاں کمی کیا ہے

عرض کی دے چکا ہے مجھ کو خدا
ورنہ لینے میں عذر ہی کیا تھا

سَر پہ احسان اس عنایت کا
پھر ملے گا اگر ہے قسمت کا

بولی خاتون تو تو ہے بچا — ابھی قدرت کے کھیل سمجھے گا کیا
ساری دنیا ہے اک تجارت گاہ — اس تجارت سے تو نہیں آگاہ
جو دیا تو نے اس سے بڑھ کے لیا — لال سی جان اک بچا لایا
ہے وہ دنیا میں کون سا موتی — جان سے جو کہ ہو سوا موتی
بھر دے اللہ موتیوں سے جو گھر — اور مجھ سے طلب کرے یہ پسر
تو خدا کی قسم نہ میں دوں گی — گھر لٹا دوں گی اس کو لے لوں گی
بھیک مانگوں گی خاک اڑاؤں گی — دل کا ٹکڑا انہیں گنواؤں گی
تو نے اپنا گنوا دیا موتی — اور مجھے میرا لا دیا موتی
دے دوں گر اپنا سارا سرمایا — تو بھی بدلہ نہ ہو برابر کا
دے چکا جو خدا کو دینا تھا — اب تو مجھ سے ہے یہ تیرا سودا
ماں مجھے مان اے مرے بچے — ایک چھوٹا تھا دو ملے بچے
اب تجھے کیا میں جانے دوں گی بھلا — ضد نہ کر حکم مان مادر کا
تو ہے بس اور یہ بھائی تیرا ہے — اور وارث ہی کون میرا ہے
مگر اتنا تو پہلے مجھ کو بتا — موتی لے جا کے تو کرے گا کیا
قصہ ناصر نے سب وہ دہرایا — جس میں پنہاں تھا راز موتی کا
اور شرما کے ہو گیا خاموش — دل میں خاتون کے اٹھا اک جوش
بولی چل بیاہ میں رچاؤں گی — ساس بن کر بہو کو لاؤں گی
دیکھنا ہیں نواب کے موتی — ہیں وہ کس آب و تاب کے موتی
میرے آگے وہ کر سکیں گے نہ چوں — تو سہی موتیوں سے لاد نہ دوں
اور چڑھاوے کی نتھ میں چمکیں گے — دونوں موتی یہ میرے کانوں کے
ہے کہاں اور موتیوں میں بھلا — خاص ناتا قریب کا رشتا
شفقتیں کر رہا تھا تاجر بھی — ہوا خاموش ادب سے ناصر بھی
دل سے تھی لو لگی ہوئی یہ مگر — مجھ کو احسان مند غیر نہ کر
دیکھیے اب یہ غیب کا سامان — سامنے آیا ایک کشتی بان
سر جھکایا ادب سے بہر سلام — پھر کیا ہاتھ جوڑ کر یہ کلام

بڑھ کے محنت سے جب ملے پیسا — کوئی ایمان کھوئے کیوں اپنا
لیجیے اُس کو سیپ ہے یہ وہی — آپ نے ہاتھ سے جو پھینکی تھی
اپنی کشتی پہ اس کو روکا تھا — اُسی کشتی پہ لے کے آیا تھا
سُن کے یہ دنگ رہ گیا تاجر — سجدۂ شکر کو جھکا ناصر
دیا ناصر نے اس کو اور انعام — ہوا ہاتھوں سے جس کے غیب کا کام
سیپ کو چیر کر الگ جو کیا — نکلے دو موتی اس سے بیش بہا
جوڑی بے عیب ایسی اور با آب — کہیے انمول جس کو اور نایاب
اپنی جادو نوں فرد تھے موتی — ساری دنیا کے گرد تھے موتی
عجب اسرار کچھ ہیں قسمت کے — دیکھیے کھیل اس کی قدرت کے
اک پسر کے انھوں نے دو پائے — باپ ماں پھر سے اس کو ہاتھ آئے
حکم ملنے میں دیر اب کیا تھی — ہوئی فوراً سفر کی تیاری
مل کے خوش خوش وہ یوں وطن کو چلے — جس طرح بوئے گل چمن کو چلے

چلیے اب جانبِ محل بھی ذرا — کہ وہاں دیکھیں ہو رہا ہے کیا
حالِ دُردانہ کیا ہوا غم میں — گزری کیسی نواب و بیگم میں
روز جب ایک دن کہے اک بات — تو بگڑ جائے کیوں نہ بنتی بات
اس طرف ضد گھمنڈ میں اپنے — کہ ہو شادی اگر تو صولت سے
اور اُدھر ہٹ کہ چاہے جو ہو جائے — لڑکی باہر محل کے جانے نہ پائے
اور دُردانہ جان سے بیزار — مرنے اور زہر کھانے پر تیار
صولت اپنی جگہ یہ تاک لگائے — جلد شادی کسی طرح ہو جائے
روز صادق کی یہ نواب کو پند — رہیے میعاد شرط کے پابند
یوں ہی انتیس[۲۹] دن مہینے کے — ہو گئے ختم ایک اک کر کے
اب فقط ایک روز تھا باقی — اور نصیبوں کا فیصلہ باقی
کچھ عجب کش مکش کی حالت تھی — اک سحر گاہ دو کی حسرت تھی
دو رُخہ تھا نصیب کا پانسا — ایک کو تخت ایک کو تختا

اس کی شادی تھی اس کی ناشادی — اس کی بربادی اس کی آبادی
منزلِ شوق ایک دو رہ گیر — اک نشانہ مراد کا دو تیر
ناصر اس دُھن میں آرہا تھا ادھر — ہو درِ دوست پر پہنچ کے سحر
تھا نظر میں سواد کوئے حبیب — آرہی تھی ہوا سے بوئے حبیب
پاس قصبہ کے اک سَرا تھی بڑی — جو کسی راستوں کے بیچ میں تھی
آکے اس جا ٹھہر گیا تاجر — نہ مگر ایک دم رُکا ناصر

نیند صولت کو ہو رہی تھی حرام — کہ ہے امید کی یہی اک شام
نہ اگر آج بھی ہوئی شادی — تو ہے بعد اس کے پوری بربادی
گھر علانیہ ہو گا جب نیلام — بولی بولیں گے آکے خاص و عام
ٹھاٹھ مٹ جائے گا امیری کا — حال کھُل جائے گا فقیری کا
بیٹی پھر دیں گے کاہے کو نواب — اور ہو گا خراب حال خراب

گھر پہ نواب نامور کے گیا — عاجزی کر کے ساتھ لے آیا
اک بہانہ تھا رسم دعوت کی — کر دی حد منت اور سماجت کی
کہ کسی طرح شب نہ کٹنے پائے — آج ہی رسم عقد کی ہو جائے
جب گئی یہ بھی کوشش اس کی فضول — اور نواب نے کیا نہ قبول
بدمعاشوں کو ایک خط لکھا — جس کی تحریر جال سازش کا
باتوں باتوں میں دیر کی اتنی — رات آئی اندھیری پھیل گئی

صادق اپنی جگہ پریشاں تھا — کہ جو خط ڈاکیے نے لا کے دیا
دوست نے دوست کو یہ لکھا تھا — کہ شبِ جمعہ میں بھی پہنچوں گا
وہی وعدے کا آخری دن ہے — کامیابی کا جو کہ ضامن ہے

لے رکھو ایک شاندار مکان — ہو ضرورت کا جس میں سب سامان

لکھنے والے کا نام ناصر تھا
پڑھتے ہی خط کو صادق آگے چلا

پہنچا سیدھا نواب کے گھر پہ
کہ ہوں بیگم بھی شاد پا کے خبر

ہوئے خادم یہ کہنے پر مجبور
دن سے صولت کے گھر گئے ہیں حضور

ماتھا صادق کا بس وہیں ٹھنکا
گھر کا صولت کے رُخ وہیں سے کیا

طے ہوئے تھے نہ کوچہ و بازار
دیکھا جاتا ہے ایک خدمت گار

اُس نے صادق کو جیسے ہی دیکھا
وہیں کترا کے راستا بدلا

دیکھتے ہی وہ کچھ اُدھر سنکا
ماتھا صادق کا بھی اِدھر ٹھنکا

کہ یہ کرتا تھا مجھ کو جھک کے سلام
دیکھا اور پھر کیا نہ رک کے سلام

کیوں یہ برتاؤ کچھ ہے بھید ضرور
کہ جو اس نے بدل دیا دستور

وہ بھی لپکا قدم بڑھاتا ہوا
یہ بھی جھپٹا نظر بچاتا ہوا

اُس کے چلنے میں ٹھوکر ایسی لگی
کہ سنبھلنے میں گر گئی پگڑی

پھر جو پگڑی اٹھا کے وہ بھاگا
تو ہوا ہو گیا پتہ نہ لگا

وہیں صادق بھی بعد میں آیا
اک لفافہ پڑا ہوا پایا

بس وہیں سے یہ اُلٹے پاؤں پھرا
اور اُجالے میں لا کے اس کو پڑھا

تھا لفافہ پہ نام صولت کا
اور اندر جوابِ خط یہ تھا

ہو گی تعمیلِ حکم خاص شتاب
گھر نہ پہونچیں گے ناصر و نواب

ہاتھ دونوں میں آگیا جو صید
حسبِ منشا رہے گا دو دن قید

تاکہ میعادِ شرط ٹل جائے
عذر نواب سے نہ بن آئے

دستخط لے کے آپ کی تحریر
صبح تک بھیج دیں گے بے تاخیر

پڑھتے ہی خط جو راز فاش ہوا
پہنچا تھانے پہ دوڑ لے کے پھرا

پلٹے نواب کھا کے جب دعوت
آیا پہنچانے تا بہ در صولت

شب تھی تاریک راہ ناہموار
ساتھ تھا صرف ایک خدمت گار

آگے آگے وہ لالٹین لیے
پیچھے نواب شان و شوکت سے

وہم بھی دل میں تھا نہ خطرے کا
دفعتہً ڈاکوؤں نے گھیر لیا

پہلے دھمکایا جبر و قہر کے ساتھ
لے چلے اُس کے بعد باندھ کے ہاتھ

جب ذرا بھی یہ کسمساتے تھے
تو وہ ظالم چھری دکھاتے تھے

نہ اجازت تھی بولنے کی بھی
ہائے رے بے کسی و مجبوری

راہ میں چند ڈاکو اور ملے
کہ جو ناصر کو گھیر لائے تھے

چاہتے تھے کہ لے چلیں اُس جا
خفیہ تہ خانہ ہے جو چھپنے کا

کیسے بے بس تھے ناصر و نواب
بس نگاہوں میں تھے سوال و جواب

ابھی رستے ہی میں تھے یہ فاسق
کہ لیے دوڑ آگیا صادق

ڈاکوؤں کو پولس نے گھیر لیا
پھنس گئے یوں کہ کوئی بس نہ چلا

ڈال دی پہلے ہتھکڑی سب کے
ہاتھ نواب کے بھی پھر کھولے

بڑھ کے صادق نے خط بھی پیش کیا
اور نواب نے بغور پڑھا

ہو گئے غرق بحرِ حیرت میں
زہر نکلا شرابِ الفت میں

دوست نے دوست کو جو پہچانا
ایک سے ایک دوڑ کر لپٹا

بڑھ کے نواب بھی گلے سے ملے
لے کے دونوں کو ساتھ گھر پلٹے

ہوئی صوکت کو جس گھڑی یہ خبر
ہو گیا گھر سے وہ رفو چکر

گئی دوڑ اور یوں ہی پلٹ آئی
نہ خبر اس کی پھر کبھی پائی

دوسرے روز گھر ہوا نیلام
کیا تاجر نے مول لے کے قیام

دلِ نواب اس طرح بدلا
کہ جو ناصر تھا اب وہ کوئی نہ تھا

جتنی صوکت سے ہو گئی نفرت
اتنی ناصر سے بڑھ گئی الفت

بیگم اپنی جگہ ہوئیں دل شاد
پائی گھر بیٹھے جیسے دل کی مراد

جب یہ دُردانہ نے خبر پائی
تن بے جان میں پھر سے جان آئی

گرم ہر رگ میں تھا خوشی سے خون
دل میں صادق کے تھے سبھی ممنون

اب رکاوٹ تھی کون سی باقی
ہوئی ناصر کی دھوم سے شادی

جیون سرود

میری فلمی زندگی کو سات سال ہوئے۔ چھ کلکتہ میں اور ایک بمبئی میں۔ سب سے پہلے نیو تھیٹرز فلم کمپنی میں بلایا گیا اور وہاں چھ سال رہا۔ منزل پکچر سے ابتدا ہوئی جس میں مکالموں کی درستی اور گیتوں کی تصنیف میرے ذمہ تھی۔ مکالموں کی زبان درست کرنا، فقروں میں برجستگی پیدا کرنا خیر یہ تو معمولی کام تھا مگر گانوں کا بنانا میرے لیے بالکل نیا اور مشکل کام تھا۔

ایک مثل ہے کہ رونا ہنسنا گانا کون نہیں جانتا۔ بس میں ایسا ہی گانا جانتا تھا نہ میں نے کبھی گانا سیکھا تھا، نہ کبھی شوقیہ طور پر گانے کا اتفاق ہوا تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ میں غزل تک لہجہ کے ساتھ نہیں سناتا ہوں۔ کام آتا تھا اور کرنا فرض منصبی میں داخل تھا آخر اٹکل پچو گانے بنائے۔ وہ بامعنی ضرور تھے اور محل موقعہ کے مناسب ان میں کچھ شاعرانہ رنگینی بھی تھی۔ خدا کی شان کہ گانوں نے عام مقبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد مکتی کے گانے لکھے، ان گانوں کی بہت شہرت ہوئی۔ پھر تو گویا میں گانے ہی بنانے کے لیے نوکر ہوا تھا۔

کہانی تو ڈائریکٹر خود لکھتے تھے، ہاں ادبی نگرانی اکثر مکالموں کی میرے ذمہ تھی۔ مکتی کے بعد جب میں نے یہ محسوس کیا کہ ہر پکچر کے گانے مجھی کو بنانا پڑیں گے۔ دوسروں کے بنائے ہوئے گانے نظر انداز کر کے جب دوبارہ مجھ سے گانے بنوائے جانے لگے تو میں نے سمجھ لیا کہ مجھے ہی کرنا ہوگا۔ اب ضرورت پڑی کہ اوزانِ عروضی و اوزان موسیقی کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لوں۔ اوزان عروضی سے آگاہ ہی تھا۔ اوزانِ موسیقی کے سمجھنے میں عروض سے بہت مدد ملی اور غور کرنے سے پتہ چلا کہ عروضی پابندیاں گانے کو بے کیف کر دیتی ہیں۔ عروض میں جو وزن اختیار کر لیا جاتا ہے پھر اس میں تبدیلی درست نہیں اور اوزانِ موسیقی میں یہی تبدیلی اس کا حسن ہے اور ایک نکتہ یاد رکھنے کا ہے کہ اوزانِ

عروضی میں وزن کی بنیاد حرکات و سکونات حرف پر ہے۔

ساکن و متحرک حرف برابر سمجھا جاتا ہے لیکن اوزانِ موسیقی میں سکونات کے فرق کو محسوس کر کے ان کا نظامِ ترتیبی نئی نئی شکلوں میں قائم کیا جاتا ہے اسی نے اوزانِ موسیقی کو پُر کیف بنا کر اس کا دائرہ وسیع کر دیا ہے۔

اتنا سمجھ لینے کے بعد میں نے نئے نئے اوزان محل اور موقع کے مناسب کبھی انتخاب کیے کبھی اختراع کیے۔

نغمہ نگار کی دقتیں

اب میں ان دقتوں کو بیان کرتا ہوں جو ایک فلمی نغمہ نگار کو پیش آتی ہیں۔

۱۔ گانا کس موقعہ کا ہے اس کے مناسب حال بنیادِ خیال۔

۲۔ کردار کس حیثیت کا ہے اور کیسے جذبہ میں بھرا ہوا ہے۔ اسی کی مناسبت سے تخیل اور لفظوں کا انتخاب۔

۳۔ بنیادِ خیال کے ساتھ شاعرانہ رنگ آمیزی۔

۴۔ وزن موسیقی کا انتخاب یا اختراع۔

۵۔ ان سب مرحلوں سے گذرنے کے بعد جاہلانہ اعتراضات کا جواب۔

۶۔ میوزک ڈائرکٹر کو سمجھانا۔ اس گروہ میں اکثر ایسے ہیں جو اردو ہندی نہیں سمجھتے اور لفظوں کو توڑ مروڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

قابلِ عبرت بات یہ ہے کہ کسی وزن کو تو وہ سمجھ جاتے اور کسی وزن کو بہ مشکل سمجھتے ہیں۔ اور بعض تو ایسے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ دوسرا گانا لکھ دیجئے۔ وہ اپنی مشکل کو دیکھتے ہیں دوسرے کی مشکلیں انھیں نظر نہیں آتیں کہ ایک گیت کتنے مرحلے طے کر کے بنتا ہے۔